TEXT CUT WITHIN THE BOOK ONLY

جلد ۲
نمبر ۵

محسن الملک

قیمت سالانہ ۲ روپے
ششماہی ۱ روپے

فہرست جنوری سنہ ۱۹۲۵ء

نغماتِ قدس

اس وقت کا ذکر ہے جب ہمارا قیام باغ فرحت افزا کی مسجد میں تھا، ایک شب پچھلی رات کی بہار دیکھنے باغ کی سیر کو نکلے ساری دنیا پر ایک سناٹا ایک سکوت اور ایک خموشی کا عالم طاری تھا، گرمی کا موسم تھا آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے مگر شب بیداری نے سب کو مخمور کر دیا تھا، ہمنے مسجد سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ سب تارے کھل کھلا کر ہنس پڑے، مشتری نے جو ان سب میں زیادہ روشن و درخشاں تھا ذرا جھک کر کہا:۔

جانعالم! کہاں چلے؟

ہمنے کہا باغ کی سیر کو۔

سب تاروں نے کہا ذرا ٹھیرو، جب سورج کی کرنیں فضاے دہر کو منور کریں اس وقت باغ کی سیر کرنا، ہم جھلملاتے تارے ایک گھڑی کے مہمان ہیں، شب بھر کی بیداری سے تھکے ہوئے ہیں اگر اس وقت زہرہ کچھ گنگنائے تو سب تکان دور ہو جائے، تمہارے کہنے سے شاید وہ کوئی نغمۂ دلکش سنائے، ہمنے زہرہ کی طرف دیکھا، مسکرائی اور ایک انگڑائی لیکر گیت شروع کیا، عجیب دل ہلا دینے والا ترانہ تھا، صبح کا جھٹ پٹا ہو چلا تھا، تاروں کو گانا سنکر وجد ہوا اور پھر سب بیہوش ہو گئے، آسمان پر ایک تاریکی چھا گئی، اتنے میں آفتاب افق مشرق سے طلوع ہونا شروع ہوا نورانی شعاعیں ہر طرف پھیلنے لگیں، آسمان کی تاریکی دور ہوئی اور تمام تارے بھی محو خواب ہو گئے۔

ہم باغ میں سیر کرنے لگے، طیور چہکے، پھول مہکے، کلیاں چٹکیں، اور پتے جھلکے، غرض ساکنان باغ نے بڑی خوشی سے ہمارا خیر مقدم کیا، سہانا وقت اور نسیم خوشگوار کے روح پرور جھونکے عجب کیفیت آور تھے، ہم ایک سبزہ زار میں نماز فجر کے لئے قبلہ رخ ہوئے، اہل چمن بھی نماز کی تیاریاں کرنے لگے، سب نے قطرات شبنم سے وضو کیا، پھر سرو کو امام بنایا، لالے نے تکبیر کہی بعد سلام کے پھولوں نے

رنگین عبارت میں دعا مانگی، پھر ایک استغراق کا عالم طاری ہو گیا، کسی نے کان میں کہا ؎

ہر گیاہے کہ از زمیں روید — وحدہٗ لاشریک لہ گوید

نباتات کی نماز کا فلسفہ ہماری سمجھ میں آگیا اور ہم مطمئن ہو کر قرآن حکیم کی آیتہ "یسبح للہ ما فی السموات و ما فی الارض" پڑھتے ہوئے باغ کی ہوا کھانے لگے۔

صبح کا سہانا وقت کس قدر فرحت بخش و نشاط انگیز ہوتا ہے جس شے پر نظر ڈالو، صبح کے نورانی منظر سے محظوظ و مسرور دکھائی دیتی ہے اور خالق کائنات کے رنگا رنگ جلووں سے لطف اندوز ہو کر تسبیح و تہلیل کرتی نظر آتی ہے۔ کوئی ذرہ بھی ایسا نہیں جو حمد و ثنا میں مشغول نہ ہو مگر آہ! انسان، غافل انسان اسوقت محو خواب اور مصروف راحت ہوتا ہے۔ وہ جسے اشرف المخلوقات کا ممتاز لقب بخشا گیا۔ وہ۔ جسے عالم کے ہر ہر ذرہ پر برتری اور بزرگی عطا کی گئی۔ اس وقت پاؤں پھیلائے سوتا ہے۔ وہ انسان، جسے عبدیت کے امتیاز سے سرفراز کیا ہے، حق بندگی سے بے خبر ہے، کائنات کا ہر ذرہ عبادت میں مشغول ہے مگر وہ جسے محض عبادت کے لئے پیدا کیا گیا اسوقت غفلت کی نیند سو رہا ہے جب کہ دنیا کی ہر ہستی، جہان کا ہر وجود، اور عالم کی ہر چیز اپنے خالق کی اپنے مالک کی یکتائی زبان حال سے بیان کر رہی ہے۔

اے اشرف المخلوق! بیدار ہو، اپنے پروردگار کی بے نہایت قدرتوں اور بے شمار حکمتوں میں غور کر، نورانی جلووں کا تماشہ دیکھ اور سجدہٗ نیاز ادا کر ؎

اگر ذوق محبت ہے تو کچھ ارمان پیدا کر — نئے انداز پیدا کر نرالی شان پیدا کر
زبانی گفتگو سے کام چل سکتا نہیں قدسی — محبت تجھ پہ خود نازاں ہو وہ سامان پیدا کر

آفتاب نمودار ہوا سنہری کرنیں کائنات کے ہر ذرہ کو درخشاں کرنے لگیں رات کے کملائے ہوئے پھول

اور مرجھائے ہوئے پودے تر و تازہ ہوئے، بند کلیاں کھلنے لگیں ———— اور پتیاں کلی کی ہم آغوشی سے جدا ہو کر تھر تھرانے لگیں۔ ماجرائے شب کے متعلق آس پاس کی جھاڑیوں سے چھیڑ ہونے لگی، چمن کے تمام چھوٹے بڑے پودے جوش مسرت میں جھوم رہے تھے، پھول اور پتے عجب دلربائی و رعنائی سے جذبات کی رنگا رنگ لذتوں کا اظہار کر رہے تھے ہم ایک طرف کھڑے ہو کر قدرت کردگار کا تماشہ دیکھنے لگے۔

ہمارے قریب ہی پودوں کا سپہ سالار تھا جسکو عرف عام میں سرو کہتے ہیں، ہمیں خموش دیکھکر بولا:۔

جانعالم! کس سوچ میں ہو؟

ہمنے کہا، صناع حقیقی کی صنعت کاریوں اور ان کی رنگا رنگیوں سے محو حیرت ہیں۔

بولا:۔ اے جانعالم! حق تعالیٰ کی صنائع و بدائع کی کوئی حد و نہایت نہیں، کائنات کا ہر ذرہ بے شمار عجائبات کا مجموعہ ہے۔

ہمنے کہا:۔ اے سرو تم بڑے حسین ہو

بولا:۔ یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے ورنہ حقیقت میں حسین تم ہو، تمہارا حسن جمالِ حق کا مظہر اور انوار حق کا مصدر ہے۔ تم کائنات کے تمام محاسن کا مجموعہ ہو۔

ہمنے کہا یہ سچ ہے، لیکن تمہارا حسن بھی مرغوب ہے، دیکھو شاعر لوگ اپنے معشوق کے حسن کی جب تعریف کرتے ہیں تو قد کی تشبیہ تمہارے ہی قد موزوں سے دی جاتی ہے۔

پاس ہی گلاب کا پودا تھا اُسنے ہماری گفتگو سُنکر اپنی ایک شاخ کو ہماری طرف بڑھایا اور اپنے نوکدار کانٹوں سے ہمارا دامن کھینچا۔ ہمنے مڑکر دیکھا، خوشرنگ پھول کھلکھلا ہنسا اور کہنے لگا۔

جانعالم! تم بڑے نادان ہو، شاعر تو یوں ہی بے پر کی اڑایا کرتے ہیں، بھلا ہم نباتی ہستیوں کا انسانی حسن و جمال سے کیا مقابلہ ع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک،

ہمنے کہا:۔ اے گلاب! شاعر بے پر کی نہیں اڑاتے، دیکھو شیراز کے ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

گلاب نے کہا :- بے شک یہ درست ہے، لیکن حضرت انساں ہی کی خاطر ہمکو یہ رنگینیاں عطا کی گئی ہیں تاکہ ہمارے رنگارنگ جلووں سے انسان اپنے بے مثل حسن کو سمجھے، ورنہ بیچارے ہم نباتی ہستیاں حسنِ انسان ہی کی ذرات ہیں بھلا ذرہ کو آفتاب سے کیا نسبت - یہ سچ ہے کہ ہر پتہ معرفت حق کی دفتر کا ایک ورق ہے لیکن ان شاعروں نے مجھ غریب کو تختۂ مشق بنایا ہے، بجائے اسکے کہ میرے اوراق سے سبق معرفت حاصل کرتے اپنے فرضی معشوق کے رخساروں سے مجھکو تشبیہ دینے لگے یا ذرا بڑھے تو میرے خاروں کو کوسنے لگے -

سامنے ہی ایک نرگس کا پودا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہماری طرف دیکھ رہا تھا، جب ہم اسکی طرف مخاطب ہوئے تو بولا :-

جانِ عالم! مجھ غریب نرگس کی شاعروں نے خوب درگت بنائی ہے کوئی تعریف کرتا ہے کوئی گالیاں دیتا ہے، میرے بھائی گلاب کی طرح مجھے بھی تختۂ مشق بنا رکھا ہے کوئی اپنے معشوق کی آنکھ سے تشبیہ دیکر میری عزت بڑھاتا ہے اور کوئی رشک سے مرا جاتا ہے کوستا اور گالیاں دیتا ہے اگر چشم حقیقت سے میری طرف دیکھتے تو میرے اوراق میں وہ نقوش نظر آتے جس سے عرفانی عقدے حل ہوتا ہے۔

سرو، جو نہایت خموشی کے ساتھ ان باتوں کو سن رہا تھا بولا :-

اے میرے عزیز پودو! تم سچ کہتے ہو، انسان بڑی غفلت میں ہے۔ مگر وہ بھی بیچارہ مجبور ہے، روٹی اور کپڑے کی فکر سے فرصت نہیں ملتی ان تفریحی تک بندیوں سے ہی دل اپنا خوش کر لیتا ہے، اگر ہر ہر پتے میں سبق معرفت تلاش کرے تو غریب روٹی کپڑے سے بھی جائے اور ننگا بھوکا پھرنے لگا۔

سرو کے پہلو میں لالہ لہلہا رہا تھا بولا :-

جناب سرو! اور میرے عزیز پودو!

آپ کی تقریریں میں نے غور سنیں جو آپ نے اپنے مطالب و معانی کے لحاظ سے بالکل بجا و درست ہیں انسان اشرف المخلوقات برگزیدہ خلائق اور پسندیدہ تبارک تعالیٰ ہے ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کا تقریروں میں تذکرہ کیا گیا لیکن جو حقیقت شناس ہیں وہ کائنات کے ہر ذرہ میں جلوۂ جمال کا مشاہدہ کرتے ہیں اور سبق معرفت حاصل کر کے حقائق آگاہ ہوتے ہیں۔

گلشنِ دہر پہ قدسی وہ بہار آئی ہے　　پتہ پتہ سے عیاں شانِ دل آرائی ہے
چشم بینا ہو تو ہر شے ہے محبت کا سبق　　ذرہ ذرہ میں نہاں حسن کی یکتائی ہے

ہم نے کہا۔ اے برادران چمن! تمہاری دلچسپ تقریروں سے ہم بہت محظوظ و مسرور ہوئے۔ دیکھو آفتاب نے بلند ہو کر تمام دنیا میں اجالا پھیلا دیا۔ طائران باغ کیسی خوشنوائی سے خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا میں نغمہ سرائی کر رہے ہیں۔

یکایک ہماری نظر سامنے مزار پر جا پڑی، سنگ مرمر کی جالیاں دھوپ میں چمک رہی تھیں ہم پر ایک سکوت طاری ہو گیا۔ نواب سکندر بیگم کا یہ مزار ہے، آہ! بیچاری بیگم اکیلی تنہا سو رہی ہے کوئی پہرہ دار نہیں پاسباں نہیں جو اس سکندر ثانی کی خوابگاہ میں جانے سے کسی اجنبی کو روکے ہم نے ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھی، کسی نے کان میں کہا:-

صبحدم طائران خوش الحان　　پڑھتے ہیں کل من علیہا فان

زندگی کی ناپائداری اور دنیا کی بے ثباتی کے خیال سے ہم پر ایک استغراقی حالت طاری ہو گئی اور ہم عالم حیرت میں آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے۔

روحیں آنا شروع ہو گئیں۔ ان میں کچھ تو اگلے حکما کی تھیں اور کچھ عشاق کی۔ ایک روح نے جو کسی بیگم کی تھی کہا:-

جانِ عالم! چپ کیوں ہو؟

ہم نے کہا۔ مسئلہ حیات و ممات پر غور کر رہے ہیں۔

روح نے کہا۔ یہ مسئلہ لاینحل عقدہ ہے، نہ کسی نے آج تک سمجھا اور نہ آیندہ کوئی سمجھے

بس، یہ یاد رکھو کہ جو پیدا ہوا ہے وہ موت کا ذائقہ ضرور چکھے گا۔ زندگی کیا ہے؟ ایک خواب ہے" اور موت کیا ہے؟ ایک بیداری ہے؟

ہمنے کہا:۔ ہمیں کیا کرنا چاہئے جس سے زندگی کا خواب ایک سکون کے ساتھ پورا ہو۔

روح نے کہا:۔ نیکی! عشاق کی روحوں میں سے ایک نے بڑھ کر کہا:۔ محبت!

نیکی، اور محبت کے مسلہ نے ہمکو پھر ایک سوچ میں ڈال دیا اور ہم وجود و شہود کے خیال میں مستغرق ہوگئے۔ یکایک ایک بجلی چمکی ہم چونک پڑے، یہ ہمارا ضمیر تھا جسنے برقی برزخ کی شکل میں نمودار ہوکر زبان حال سے کہا ؎

تار نظر ملا رہے حسن و جمال سے
ہو زندگئ دل تو اسی کے خیال سے

قدسی پڑو نہ بحث وجود و شہود میں
کچھ فائدہ نہیں ہے تری قیل و قال سے

ایک آواز نے کہا:۔

جانعالم! سلام۔

ہمنے سلام کا جواب دیکر کہا:۔

تم کون ہو؟

جواب = میں ایک نباتی روح ہوں۔

ہمنے کہا تم کہاں ہو؟

اُسنے کہا تمہارے اندر۔

ہم حیرت سے اپنی طرف دیکھنے لگے۔ ہمارے جسم سے بے شمار روحیں بجلی کی طرح چمکتی ہوئی نکلنے لگیں! ہم اس عجیب و غریب تماشہ سے بالکل از خود رفتہ ہوگئے۔

شیخ طریقت کے برزخ نے سامنے آکر ایک عارفانہ خطبہ پڑھا۔

"انسان جملہ کیفیات و محسوسات کا مجموعہ بلکہ موجودات کا خلاصہ ہے، روح انسانی نور الٰہی کا ایک

جزو ہے، اور تمام کائنات اس جزو کے ذرات کا مجموعہ ہے جسم کا خول روح کا ایک خواب ہے، جب یہ بیداری ہوتی ہے جسمی خول نابود ہو جاتا ہے۔ جو روحیں نور کے لطیف و روشن اور صاف حصہ سے پیدا ہوئیں وہ خواب میں بھی جسمی خول کی بندشوں کے باوجود اپنے مرکز اور اپنی اصالت سے جدا نہیں ہوتیں اور جو روحیں نور کے کثیف و تاریک اور پُرغبار حصہ سے پیدا ہوئیں وہ خواب میں اپنے مرکز سے اور اپنی اصالت سے بے خبر ہو جاتی ہیں اور جو روحیں درمیانی حصہ سے پیدا ہوئیں وہ عالم خواب میں کبھی بسبب ظلمت و خابیہ جسمی خول میں بالکل غافل ہوتی ہیں اور کبھی بسبب غلبہ نورانیت جسمی خول میں ہوشیار ہو کر اپنے مرکز اور اپنی اصالت کی طرف راجع ہوتی ہیں۔ جو روحیں عالم خواب میں اپنی حقیقت سے خبردار ہیں وہ کائنات کے ہر ذرہ میں اپنا پرتو دیکھتی ہیں اور جو روحیں عالم خواب میں اپنی حقیقت سے بے خبر ہیں وہ کائنات کے ہر ذرہ کو ایک جداگانہ ہستی اور ایک علٰحدہ وجود خیال کرتی ہیں، اور جو روحیں عالم خواب میں کچھ باخبر اور کچھ بے خبر ہیں وہ کائنات کے ہر ذرہ میں ایک جلوہ اور ایک جمال محسوس کرتی ہیں۔ کبھی اپنا پرتو ہر ذرہ میں دیکھتی ہیں اور کبھی ہر ذرہ کا پرتو خود میں دیکھتی ہیں اور کبھی بالکل بیگانہ اور ہر ذرہ سے دور ہوتی ہیں جسمی خول تمام لذت و مدرکات کے ملنے سے پیدا ہوتا ہے، روح جب تک اس خول میں رہتی ہے خواب دیکھتی ہے۔ اور جب اس خول سے نکل جاتی ہے خواب ختم ہو جاتا ہے، قادر مطلق نے ہر روح کو اتنی قدرت اور اختیار ضرور دیا ہے کہ وہ عالم خواب میں اگر کوشش کرے تو خواب کی مدت ایک سکون کے ساتھ پوری ہو جائے اور وہ کوشش نیکی اور محبت کی ہے"۔

اس عارفانہ خطبہ کو سنکر ہمکو اطمینان ہوگیا ہمنے آنکھیں کھولیں اور اُٹھ کر اپنی قیام گاہ کیطرف یہ کہتے ہوئے چل دیئے ؎

آرزو ہو کہ گنج راز ہو — سارے عالم سے بے نیاز ہو

بھید کھل جائینگے سبھی قدسی — آشنائے نیاز و ناز ہو ✣

قدسی

عہد سلطانی کا دورِ زرّین

مغتنمات سے ہیں وہ نفوس، جو قوم و ملک کی فلاح و بہبود میں سرگرم کار رہتے ہیں، اور مبارک ہیں وہ ہستیاں جو اصلاح ملک و قوم میں اپنے قوائے عملی کو کام میں لاتی ہیں، بدقسمت ہے وہ قوم، جو ایسے افراد کی جد و جہد سے درس پذیر نہو اور اپنے آپ کو خلیج مذلت سے نہ نکالے، جس طرح برسات کا موسم نباتات کی قوت نامیہ میں ایک برقی اثر پیدا کر دیتا ہے، اسی طرح ایسے افراد کی سرگرمیاں خوش قسمت ملک و قوم کو آسمان کمال تک پہونچا کر اُس کے دل میں ارتقائی روح پھونک دیتی ہیں، اور وہی قوم جس کا احاطہ نظر کل تک تنگ و تاریک تھا، آج میدان ترقی میں سرعت کے ساتھ تگ و پو کرنے لگتی ہے، یہ مسلم ہے کہ جب دنیا انحطاطی دور میں گھر جاتی ہے تو منجانب اللہ کوئی مصلح، قائد اعظم عنان ترقی اپنے ہاتھ میں لیکر کھڑا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ اسکی عملی جد و جہد، اُسکا استقلال، اپنے مطمح نظر کو پورا کرلیتا ہے۔ اور اپنے نوخیز پودوں کو سر بہ فلک کشیدہ اشجار کے دوش بدوش دیکھکر اُسکے دلمیں مسرتوں کا سمندر موجزن ہو جاتا ہے، اب وہ جس طرف نظر اٹھاتا ہے، تو آنکھوں کے سامنے بجائے ظلمت و تاریکی کے نور ہی نور ہوتا ہے۔ ہر وہ شخص جسکی نظریں، اہم ترین کوششوں کے بعد جب ایسے پُر نور مناظر سے لطف اندوز ہوتی ہیں تو اُن مسرتوں کا اندازہ صرف وہی کرسکتا ہے، جسکی عملی کوششوں نے اسکی نگاہوں کے سامنے ایسے مناظر پیش کیے ہوں

آج جو بھوپال کا مطلع پر انوار ہو رہا ہے، اور دور سلطانی نے اُسکو پر نور بنانے میں جن جن مساعی جمیلہ اور قوائے عملیہ سے کام لیا ہے، اُسکی تشریح ہم فروری نمبر میں کرینگے، اسوقت ہمیں صرف یہ دکھانا مقصود ہے، کہ ہر ہائینس بیگم صاحبہ فرمانروائے بھوپال کا وجود ہمارے حق میں کیا ہے، اور اُس ذات والا نے ہمیں ارتقائی دَور میں لانے کے لیئے کیا کیا ایثار کیے ہیں، بلاشک ہم کہہ سکتے ہیں کہ فرمانروائے بھوپال نے باوصف ایک صنف جمیل ہونے کے ہم کو حقیقی معنوں میں مرکز قومیت پر جمع کرنے کے لئے جو جو کوششیں کی ہیں، وہ ایک درس زرین ہے، جس کا تنہا معلم صرف دور سلطانی ہی کہا جا سکتا ہے۔

نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ خلد مکاں کے انتقال کے بعد جسوقت ہر ہائینس بیگم صاحبہ بھوپال نے عنانِ حکومت اپنے دستِ مبارک میں لی۔ اسوقت بھوپال کی اقتصادی و ذہنی حالت پستی و انحطاط میں گھری ہوئی تھی، اور اہل بھوپال کی ذہنی فضا، علم و فضل کے بجائے، جہل کی ہولناک تاریکیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی، لیکن ممدوحہ نے سب سے پہلے بھوپال کی اقتصادی و زرعی اصلاح کی طرف توجہ فرمائی، اور مسلسل چند سال تک جس امر کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف کار رہیں اور اُنکے

فارغ ہونے کے بعد بھوپال کو علمی روشنیوں سے منور کرنے کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ ممدوحہ نے جس جوش اور ہمدردی سے باشندگان بھوپال کی تعلیم کی طرف توجہ فرمائی وہ آپ کے عہد مسعود کا قابل قدر و شاندار عنوان ہے، اور اسی جد و جہد کا نتیجہ ہے کہ آج بھوپال اہل علم و ارباب فضل کا مرجع بنا ہوا ہے، اور وہ گھرانے اور خاندان جو آج تک جہل و نادانی کا شکار ہوتے چلے آرہے تھے دولت علم سے بہرہ ور اور مالا مال نظر آرہے ہیں۔

اسکے علاوہ ممدوحہ کی علمی سرپرستیاں بھوپال ہی تک ہی محدود نہیں رہیں، بلکہ آپ نے ہندوستان کے ہر علمی مرکز اور علمی جماعت کو جس خلوص سے امداد و اعانت پہونچائی، اسکی نظیر اسوقت مشکل تلاش کی جا سکتی ہے، اور پھر خود فرائض حکمرانی کی انجام دہی کی مصروفیتوں کے باوجود اپنے استراحت و آرام کے اوقات میں تصنیف و تالیف کے ذریعہ سے قوم و ملک کی خدمت میں برابر سرگرم کار رہیں، علی الخصوص صنف نازک کی پستی کو دور کرنے کیلیے جس مستعدی و کوشش سے کام لیا ہے وہ ہماری قوم کو گرانبار احسان بنائے رکھے گا۔ مختصر یہ ہے کہ حضور ممدوحہ کی گرانقدر سرگرمیاں اس دور اور اس عہد میں ہر زن و مرد، امیر و غریب کے لیئے ایک بہترین نمونہ عمل اور ایک نادر ترین درس ہیں، جو اس مختصر مضمون میں کسی طرح پیش نہیں ہو سکتیں۔ لیکن آئندہ نمبر میں اُن کی تفصیل ناظرین "محسن الملک" کے لیئے زیادہ اہتمام و کاوش سے پیش کی جائیگی۔

ہماری دعا ہے کہ حضور ممدوحہ کی ذات والاصفات سے اہل ملک کو تا دیر مستفید ہونے کا موقع ملتا رہے

آمین

ایڈیٹر

ایک اسکاوٹ اجتماع

منڈلہ میں صوبہ متوسط کے اسکاوٹوں نے مئی کا پہلا ہفتہ منایا تھا، یہ اجتماع اپنی نوعیت کا یکتا تھا، ہندوستان میں اب تک ایسا مہتم بالشان اجتماع نہیں ہوا ہے، مجھے اخباری نمایندے کی حیثیت سے متذکرہ اسکاوٹ اجتماع میں شریک ہونا پڑا تھا، اسکاوٹ اجتماع سے میں نے بہترین اثر لیا ہے، ایک ہزار سے زیادہ کم سن، اور نوجوان، بوڑھے، اور حکام اسمیں شریک ہوئے تھے، لیکن اس شاندار اجتماع کی روئداد پر تفصیلی بحث کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسکاوٹ تحریک پر روشنی ڈالی جائے۔

اسکاوٹ تحریک کیا ہے؟

سر رابرٹ بیڈن پاول نے انگلستان میں بوائے اسکاوٹ، کی تحریک کا آغاز کیا تھا، تحریک کا مقصد یہ ہے کہ لڑکوں میں اعلیٰ شہریت کے جذبہ کو ترقی دیجائے اور ان کے اخلاق سنوارے جائیں، ان میں قوت مشاہدہ، خود اعتمادی، اور قوم اور شہنشاہ کی وفاداری پیدا کی جائے، نیز انہیں ایسے کام سکھائے جائیں جو ان کے اور دوسروں کے لئے مفید ثابت ہوں، صاف لفظوں میں کہنا چاہیئے کہ نفع رسانی خلق، اسکاوٹ کی زندگی کا نصب العین ہوتا ہے۔

سب سے پہلے بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ یہ ایک غیر معاشی انجمن ہے، یہ ایک غیر سیاسی، غیر سرکاری، غیر نسلی، غیر مذہبی، اور غیر حربی، تحریک ہے، ہر ایک مذہب و ملت اور ہر ایک عقیدہ کا لڑکا بوائے اسکاوٹ، تحریک میں شامل ہو سکتا ہے، جب کوئی لڑکا اسکاوٹ بنایا جاتا ہے تو سب سے پہلے اسے تین وعدے کرنے پڑتے ہیں:-

(۱) کہ وہ خدا اور بادشاہ کا وفادار رہے گا۔

(۲) وہ ہر وقت دوسروں کی اعانت کریگا،

(۳) اور اسکاوٹ کے قوانین کی پوری پابندی کریگا، جس اسکاوٹ قانون کا حوالہ دیا گیا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ:-

(۱) وہ ہر ایک اسکاوٹ پر اعتماد کریگا اور اسکی عزت کریگا۔

(۲) وہ خدا، بادشاہ، والدین، اساتذہ، مخدوم، رفقا، اور ملک کا وفادار رہے گا

(۳) وہ اپنے آپ کو مفید بنائیگا اور دوسروں کی امداد کے لیئے ہر وقت آمادہ رہے گا۔

(۴) وہ ہر شخص کا دوست اور ہر ایک اسکاوٹ کا بھائی بنے گا چاہے مذکورہ شخص کسی بھی معاشری طبقہ سے تعلق رکھتا ہو۔

(۵) وہ مودب اور باتہذیب رہے گا۔

(۶) جانوروں کا دوست ہوگا، اور انہیں ظلم و تعدی سے محفوظ رکھے گا۔

(۷) وہ فرمانبردار ہوگا۔

(۸) چاہے کتنی مصیبت پڑے وہ ہمیشہ شادان و فرحاں رہے گا۔

(۹) وہ کفایت شعاری کو مدنظر رکھے گا۔

(۱۰) وہ ظاہری اور باطنی پاکیزگی ملحوظ رکھے گا۔

اسکاؤٹ تحریک کے یہی متبرک اصول ہیں، کوئی قوم اور کوئی ملک ان اصول پر متعارض نہیں ہو سکتا اور یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ، جرمنی، فرانس، ہالینڈ، ڈنمارک، اطالیہ، ترکی، مصر، فلسطین، ایران، ہندوستان اور تمام مستعمرات و مقبوضات برطانیہ میں اسکاؤٹ تحریک پھیل گئی ہے۔

ابتدائی تاریخ

لفٹننٹ جنرل سر رابرٹ بیڈن پاول کی زندگی میں اس سے بڑھ کر کوئی خوشی کا موقعہ نہ ہوگا کہ وہ اپنی تحریک کو دنیا کے تمام متمدن ملکوں میں ترقی پذیر دیکھیں، انہوں نے ۱۹۰۸ء میں محض بطور تجربہ انگلستان کے چند لڑکوں کو اس تحریک میں شامل کیا تھا، سر بیڈن پاول کو یقین نہیں تھا کہ ان کی تحریک اتنی سرعت سے پھیل جائیگی، وہ ہندوستان کے وحشی باشندوں، گونڈ، بھیل، اور افریقہ کے رہنے والوں کی سادہ اور موافق فطرت زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد اس جدید تحریک کا خاکہ کھینچ چکے تھے، انہوں نے اپنے اصول کی تشہیر کے لیئے کسی اخباری شعبۂ نشریات سے کام نہیں لیا تھا، باایں ہمہ ان کی تحریک کو توقع سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوگئی، اسکی صریح وجہ یہ ہے کہ حقیقت اپنا راستہ خود بنا لیتی ہے۔

اسکاؤٹ تحریک کی مقبولیت کا اندازہ لگانے کے لیئے یہ امر واقعہ کافی ہے کہ صرف ایک سال میں بدون ترغیب انگلستان کے دس ہزار لڑکے اسکاؤٹ بن گئے، لیکن اس کے تین ہی مہینے بعد یہ تعداد اسی ہزار تک پہونچ گئی، پھر جنگ عظیم کا آغاز ہوا تو اسکاؤٹوں نے تیمارداری، راہ نمائی، محافظت وغیرہ جیسے کارہائے نمایاں انجام دیئے، جنگ عظیم سے کم و بیش تمام قوموں نے سبق حاصل کیا تھا، چنانچہ اسکاؤٹ تحریک بھی اس سبق کا جزو تھی، یہ تمام ملکوں میں رائج ہوگئی اور امریکہ بھی اسے اپنے ہاں رواج دینے سے باز نہ رکھ سکا، دسمبر ۱۹۲۰ء کے دوران میں امریکہ میں پورے چار لاکھ اسکاؤٹ تھے، لیکن جمہوریہ امریکہ کے صدر اس تعداد سے مطمئن نہیں ہوئے اور انہوں نے ایک جلسہ میں کہا کہ "جب تک ہمارے ملک کے سب لڑکے جو من حیث المجموع ایک کروڑ سے متجاوز ہیں اسکاؤٹ نہ بنجائیں ہمیں مطمئن نہ ہونا چاہیئے اور ہر ایک امریکن کو چاہیئے کہ وہ اسکاؤٹ تحریک کو فروغ

دینے کے لیئے دل اور جان سے کوشش کرے۔

آج کم و بیش پچاس ملکوں میں اسکاوٹ تحریک زور شور سے جاری ہے، اور ان سب ملکوں کے لڑکے محبت اور خلوص کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، وہ تقریباً پندرہ لاکھ ہیں۔

ہمارے ملک میں

اسکاوٹ تحریک ہمارے ملک میں نہ پھیلتی یہ ناممکن تھا، ہندوستان روز بروز برطانیہ جزائر سے گہرے تعلقات پیدا کر رہا ہے لہذا ہندوستان میں اسکاوٹ تحریک کا فروغ ناگزیر تھا، اگرچہ برطانی صوبوں سے گذر کر اب یہ دیسی ریاستوں میں بھی عمل دخل کر رہی ہے لیکن یہ افسوسناک ہے کہ اتنے وسیع براعظم میں اب تک صرف بیس ہزار اسکاوٹ پیدا ہوئے ہیں، حالانکہ یہاں کی مردم شماری ۳۱ کروڑ سے زیادہ ہے۔ لیکن امید ہے کہ مستقبل قریب میں یہ تحریک زیادہ ہر دلعزیز ہوگی۔

بوائے اسکاوٹ تحریک کے میار پر د گرل (گائڈز) نامی لڑکیوں کی بھی ایک تحریک شروع کی گئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ لڑکیاں کس طرح اپنی مدد آپ کرنے والی، ہشاش، بشاش، اور خوش حال عورتیں بن سکتی ہیں۔ لیکن ہم ابھی اس تحریک سے قطع نظر کرتے ہیں۔

ہندوستان میں بوائے اسکاوٹ تحریک کا نظام باقاعدہ قائم ہے، وائسرائے ہندوستان کے چیف اسکاوٹ ہوتے ہیں اور ہر ایک صوبے کے گورنر اپنے حدود میں چیف اسکاوٹ بنائے جاتے ہیں، اسکاوٹ انجمن کا صدر دفتر کلکتہ میں واقع ہے اور شاخیں صوبوں اور ریاستوں میں ہیں۔

منڈلہ میں اسکاوٹ اجتماع

دریائے نربدا کے ساحل پر ایک وسیع میدان ہے، یہیں اسکاوٹ جمع ہوئے تھے، اور دس دن تک کیمپ کی زندگی گزار کر بیشمار تجربات حاصل کیئے تھے، سب سے پہلے ہز اکسیلنسی سر فرینک سلائی گورنر صوبہ متوسطہ کے عزم کی داد دینی چاہیئے کہ انہی کی جدوجہد سے صوبہ کے ایک ہزار اسکاوٹ منڈلہ میں مجتمع ہو سکے، سر فرینک سلائی کے فیاض طبع احباب نے ۲۵۰۰۰ روپیہ کا چندہ فراہم کیا تھا، جو اس اہم اجتماع میں صرف کیا گیا۔

پہلی مئی کی شب کو اسکاوٹ جماعتیں اسپشل گاڑیوں میں منڈلہ آنا شروع ہوئیں، جس طرح کسی تواعد داں فوج سے توقع ہو سکتی ہے کہ وہ کہیں قیام کرتے وقت کسی قسم کا غل نہ کریگی بعینہ اسی طرح اسکاوٹ اپنے اپنے بستر خود اٹھا کر چار فرلانگ تک لے گئے اور جس جماعت کے لیئے جو جگہ تجویز کیگئی تھی وہ وہیں جا کر مقیم ہوئی، گرمی کا موسم تھا اور آم کا باغ خوب بار در ہو رہا تھا اسی باغ میں اسکاوٹوں کا قیام تھا مختلف درختوں پہ مختلف نمبر لگے ہوئے تھے، اور اسی نمبر کے بموجب اسکاوٹوں کے کیمپ تھے۔

لیکن سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ تھی، کہ کہیں قنائیں یا ڈیرے نظر آتے تھے، بلکہ معمولی چادریں شب کو تان دی جاتی تھیں، اور دن میں صرف درختوں کے سایہ میں یا دھوپ میں کام کیا جاتا تھا، صبح و شام ٹکڑوں کے اعتبار سے راشن تقسیم کیا جاتا تھا، اور ہر کس ناکس کو خود اپنا کھانا پکانا پڑتا تھا، ، پانی لانا پڑتا تھا، اور کسی دوسرے کی امداد پر بھروسہ نہیں کرنا پڑتا تھا، روزانہ ہزاروں کی تعداد میں خطوط آتے تھے جنہیں اسکاٹ پوسٹین اور اسکاوٹ پوسٹ ماسٹر کیمپ کے نمبر کے اعتبار سے تقسیم کرتے تھے۔

والیان ریاست اور امیر پسر مل کے مزدوروں کے معمولی لڑکے ہنسی خوشی سے ایک دوسرے کے دوش بدوش کام کرتے تھے، یورپین، اینگلو انڈین، اچھوت، اعلیٰ طبقہ کے ہندوستانی سب عالمگیر اخوت کے رشتہ میں منسلک تھے، حکام بھی اس اجتماع میں ادنیٰ ترین اسکاوٹ کی مانند تھے، اور یہ سب اپنا کھانا آپ پکاتے تھے، آپ ہی برتن مانجتے تھے، خود پانی لاتے تھے، خود لکڑی کاٹتے تھے،

تمام اسکاوٹوں کا لباس یکساں تھا، خاکی موزے، خاکی نیکر (جانگیہ) خاکی قمیص، بس یہی ان کا لباس تھا، ایک لکڑی، ایک رسی، اور ایک رومال، ہر ایک اسکاؤٹ کے پاس ہونا لازمی تھا، دس دن تک آفتاب طلوع ہونے کے وقت سے رات کے بارہ بجے تک روز متفرق پروگرام منضبط ہوتے تھے، اور ان کے بموجب پوری جماعت کو کام کرنا پڑتا تھا، درختوں پر چڑھنا تیراکی، درزئیں، مصوری، نجاری، معماری، تیمارداری امردوں کو بچانا، جھنڈی کے اشاروں سے گفتگو کرنا، مجرموں کا سراغ لگانا، غرض دنیا میں جسقدر بھی کام ہو سکتے ہیں، ان سب کی عملی تعلیم وہاں دیجاتی تھی، شب کو ہر روز "کیمپ فائر" ہوتی تھی، کیمپ فائر سے مراد یہ ہے کہ ایک وسیع میدان میں آگ جلائی جاتی تھی، اور وہاں انگریز اور ہندوستانی، گورنر، اور قلی سب جمع ہوتے تھے، تماشائیوں کا بھی خاصا ہجوم ہوتا تھا، وہاں ہر ایک اسکاؤٹ آزادی کے ساتھ تفنن طبع کے لیے نقلیں کرتا تھا اور اپنی خوش طبعی سے سب کو محظوظ کرتا تھا، ہز ایکسیلنسی گورنر تک کو مذاق اور خوش طبعی کا ہدف بننا پڑتا تھا، گورنر آزادی کے ساتھ لڑکوں میں چلتے پھرتے تھے، اور وہاں انہیں محافظ دستہ کی بھی حاجت نہیں ہوتی تھی۔ یہی اسکاؤٹ تحریک کی سادگی ہے، صوبے کے مغربی اور شمالی حصہ والے اسکاوٹ مشرق اور جنوب میں رہنے والے اسکاوٹ سب ایک دوسرے سے واقف ہو گئے تھے، اور انہیں اس کا احساس ہوتا تھا کہ واقعی اسکاؤٹ برادری بہت عالمگیر ہے۔

اسکاؤٹ اجتماع کے گوناگوں پروگرام کا مفصل تذکرہ بہت دشوار ہے اظاہر یہ ہے کہ کبھی اسکاؤٹوں کو جنگلات میں چھوڑ دیا جاتا تھا، اکثر اوقات ان سے کسی میل کی قواعد کرائی جاتی تھی، کبھی انجینیری کی تعلیم دی جاتی تھی، جبل پور کے صنعتی مدرسہ کے اسکاوٹوں نے اپنے کیمپ میں صرف بانس اور رسی کی مدد سے نہایت خوشنما میز، پلنگ، کرسی، اور جھولے بنائے تھے، ہز ایکسیلنسی گورنر ایک دن بہ نفس نفیس ان پر بیٹھ کر معائنہ کر رہے تھے، کہ مصوروں نے مخفی طور پر فوٹو لیے،

روز رات کو طلسمی فانوس کے ذریعہ حفظانِ صحت، اسکاوٹ تحریک کی سچی روح، وغیرہ عنوانات پر لکچر ہوا کرتے تھے، اور افسر حفظانِ صحت ہر ایک کیمپ کی صفائی کا خاص خیال رکھتے تھے، ہر شخص کے مذاق کے مطابق راشن دیا جاتا تھا۔

درحقیقت اسکاوٹ دنیا میں یہ دس دن ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے، جب گیارہویں مئی آئی تو سب اسکاوٹ سچ مچ کی حسرت آلود نگاہوں سے تمام کیمپ کو دیکھ رہے تھے، کیونکہ وہ اسی دن رخصت ہونے والے تھے، منڈلہ کے شہریوں نے ایک دعوت میں سب اسکاوٹوں کو بلایا اور پھر قواعد ہوئی، سب اسکاوٹوں نے جناب گورنر کو شکریہ کا تمغہ (ــــ) پیش کیا، پھر جناب گورنر نے ایک تقریر کی جس کا ملخص یہ ہے:-

"اسکاوٹ بھائیو! ہمارے کیمپ کا یہ آخری دن ہے، اس لئے میں ہر ایک بوائے اسکاوٹ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں، اسکاوٹ اجتماع کا انتظام کرتے ہوئے میرے پیش نظر کئی مقاصد تھے، ایک تو یہی تھا کہ سب اسکاوٹ برادران کو مسرت بخش تعطیل منانے کا موقع حاصل ہو، کیا میں اس مقصد میں کامیاب ہوا ہوں؟ (جی ہاں، جی ہاں) میرا دوسرا مقصد یہ تھا کہ صوبے کے متفرق اقطاع کے اسکاوٹ ایک جگہ جمع ہو جائیں، اور باہم شناسائی حاصل کریں، ایک دوسرے کے کاموں سے واقف ہوں، اور نیز وہ سب محسوس کریں کہ اسکاوٹ تحریک ایک عالمگیر اخوت کا نام ہے، کیا اس موقع سے آپ نے فائدہ اٹھایا ہے؟ (جی ہاں) میری دانست میں معاشری خدمت گار کا نام اسکاوٹ ہے، ڈوبتے کو بچانا، آگ بجھانا، بیمار کی تیمارداری، مردوں کو سیجانا، ناگہانی حوادث میں پہلی امداد بہم پہونچانا، الغرض اس قسم کے بے شمار کام ہیں جن کے تمغے تمہیں دیئے گئے ہیں، لیکن یہ یاد رکھو کہ اگر تمہیں یہ تمغے عطا کئے گئے ہیں تو محض نمائش کے لئے نہیں، بلکہ مثلاً اگر تم ڈوبتے کو بچانے کا تمغہ حاصل کر چکے ہو تو لازم ہے کہ جب کبھی موقع ملے، انسانیت کی خدمت انجام دو اور ڈوبنے والوں کو بچاؤ، یہ نہیں چاہیئے کہ تعلیم اور مشق کرنے کے بعد کوئی مناسب خدمت انجام نہ دو۔

میرے فیاض طبع احباب کی بدولت ایسے مہتم بالشان اجتماع کے وسیع مصارف کا انتظام چنداں دشوار نہیں ہوا، چنانچہ میری خواہش ہے کہ ان حاتم صفت احباب کے نام پر تین مرتبہ آفریں کہو، اور اتنے بڑے کیمپ کے منتظم برادر ــــ کے نام پر تالیاں بجاؤ۔

اب میں تمہیں الوداع کہتا ہوں، ہم سب کے درمیان یہ دس دن بڑی شادمانی سے گزرے ہیں، آپ کے شریفانہ خصائل کا میں ممنون ہوں، مجھے افسوس ہے کہ آئندہ یہ مسرت مجھے نصیب نہ ہوگی، کیونکہ بحیثیت آپ کے چیف اسکاوٹ کے میرا عہد گورنری ختم ہونے والا ہے، میں آپ سے ملتجی ہوں کہ اب گھر سدھاریئے، اور اس تحریک کو اپنے عزیز اور احباب تک پہونچاتے، اور سب سے زیادہ اس امر پر اصرار کرتا ہوں کہ خود اسکاوٹ کا بہترین نمونہ بنیئے اور دنیا کو دکھایئے کہ اوروں کو رغبت ہو۔"

ہز ایکسلینسی والیسرائے کا پیام

اسی دن شام کو ہز ایکسلینسی والیسرائے کا برقی پیام موصول ہوا جو حسب ذیل ہے:-

"میں جانتا ہوں کہ صوبہ متوسط کے بوائے اسکاوٹ اپنے چیف اسکاوٹ کی قیادت میں منڈلہ میں کامیابی حاصل کریں گے، امسال صوبۂ متوسط کے اسکاوٹوں کی تعداد دوگنی ہوگئی ہے، اور اس صوبہ کا شمار ہندوستان کے اور صوبوں میں تیسرے درجہ پر ہوگا، برما اور ہندوستان کے چیف اسکاوٹ کی حیثیت سے یہ میرا عقیدہ ہے کہ اسکاوٹ قانون کا سچا احترام، اسکاوٹ قاعدوں کی پابندی، اور اسکاوٹ کی اصلی شان اپنے اندر پیدا کرنا آدمی کو تمام فکروں سے بے نیاز کردیتا ہے، اچھا اسکاوٹ ہی بہترین انسان اور بہترین شہری ہے، میں اس روز کا انتظار کر رہا ہوں، جب صوبہ متوسط کے ایک ایک قریہ میں اسکاوٹ اصول پھیل جائیں گے، اور عوام کو فلاح و بہبودی بخشیں گے۔" "ریڈنگ"

اس کے بعد قومی ترانہ خدا بادشاہ کو سلامت رکھے گایا گیا، بینڈ بجایا گیا، اور منڈلہ میں زبیدا کے مسرت بخش ساحل کو حسرت کے ساتھ سب اسکاوٹوں نے خیرباد کہا۔

اسکاوٹ تحریک اور اختلافات کی خلیج

اب میں اسکاوٹ تحریک اور اس سے جو مفید نتائج مرتب ہونے والے ہیں ان پر بحث کرتا ہوں، ہندوستان میں نسلی امتیاز، مذہبی اختلاف، اور فرقہ وارانہ تضاد کی عمیق خلیج واقع ہے، مدبرین اور سیاسیئین ہزاروں تدبیریں کریں اور تجویزیں معرض عمل میں لائیں لیکن تاوقتیکہ عوام میں مساوات، بنی نوع انسان کی محبت، تجویزوں کو عملی جامہ پہنانے کی سچی خواہش نہ ہو، کامیابی محال ہے، لیکن اسکاوٹ تحریک میں یہ تمام اوصاف موجود ہیں، برطانیہ کے عظیم ترین فرزند کا ہندوستان زیر بار احسان ہے کہ انہوں نے اعلیٰ مقاصد اور اعلیٰ اصول کی تعلیم دی ہے، بین الاقوامی اتحاد کا سنگ بنیاد رکھا ہے، تخم ریزی ہوچکی ہے اور آنے والی نسلیں اسکی فصل کاٹیں گی۔

حسن عزیز جرنلسٹ

ضروری التماس

خریداران سے التماس ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری ضرور لکھا کریں، ورنہ عدم تعمیل ارشاد کی شکایت معاف۔

منیجر

مسلمان اور تاریخ

ایک اجمالی نظر

(۱)

علوم اسلامی کی تاریخ اور مسلمانوں کی علمی دلچسپیوں کے حالات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو دیگر علوم کی طرح تاریخ سے خاص تعلق تھا، اور تاریخ کی تہذیب و ترتیب میں اُن کا بڑا حصہ ہے، بلکہ حقیقتہً یہ تمام تر مسلمانوں کے شغف و انہماک ہی کا نتیجہ ہے، جو "علم تاریخ" آج اس عروج پر پہونچا ہے، اور ایک دلچسپ فلسفہ کا سرمایہ دار نظر آتا ہے۔

ہرچند اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلام سے قبل بھی متمدن قوموں میں "تاریخ نگاری" کا وجود تھا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اُس زمانہ میں صرف رطب و یابس صحیح و غیر صحیح واقعات و اخبار کے جمع کرلینے ہی کو تاریخ نگاری سمجھتے تھے، حالات و واقعات کی تحقیق و تنقید کے لیئے کوئی اصولی معیار موجود نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ قدیم یونان کی تاریخی کتابوں میں کثرت سے خرافات کی آمیزش ہوگئی، اور اُنکی تاریخی حیثیت نے فنا ہو کر من گھڑت اور بے سروپا افسانوں کی شکل اختیار کرلی۔

عربوں میں شاعری، علم الانساب، نجوم وغیرہ کی طرح تاریخ کا بھی ذوق تھا، لیکن نہایت محدود، صرف عرب کے مشہور و خاص واقعات اور ہمسایہ قوموں کے وہ حالات جو ان کو باہر کے آنے جانے والوں سے معلوم ہوجاتے تھے، اُنھیں حالات و واقعات کو ایک دوسرے سے نقل کرتے رہتے تھے، شاہان حیرہ نے قدیم زمانے کے متعلق البتہ کچھ حالات قلمبند کرائے تھے جو ایک عرصہ تک محفوظ رہے جن کو ابن ہشام نے بھی دیکھا ہے اور کتاب التیجان میں اُن کا ذکر کیا ہے، قبل اسلام عربوں میں شاہان حیرۃ کے فراہم کردہ سرمایہ کے علاوہ اور کوئی تاریخی سرمایہ نہ تھا، لیکن ظہور اسلام کے کچھ عرصہ بعد ہی انہوں نے کوشش و سعی سے نہایت کثیر تاریخی سرمایہ جمع کرلیا، اور رفتہ رفتہ تاریخ نگاری کو ترقی دیکر مفید اور دلچسپ علم بنا دیا۔

یورپ جسکو اپنی "تاریخ نگاری" و "تاریخ دانی" پر ناز ہے اور جو اپنے مفاخر علمیہ کی ترانہ سنجیوں میں محو ہو کر اپنے اسلامی محسنوں کو بھلا چکا ہے۔ تاریخ میں بھی مورخین اسلام ہی کا شاگرد ہے۔

(۲)

مسلمانوں کی تاریخی تصنیفات و تالیفات مختلف حیثیتیں رکھتی ہیں، بعض کتابوں میں حالات و واقعات سنہ و سال

کے اعتبار سے ہیں، بعض مخصوص ملکوں، شخصوں اور زمانوں سے متعلق ہیں اور بعض مغازی فتوحات، سیر وغیرہ میں لکھی گئی ہیں، لیکن طبقات و اسماء الرجال سب سے زیادہ کتابیں پائی جاتی ہیں، جنمیں صحابہ علماء فقہاء، شعراء، حکماء، اطباء، مفسرین اور محدثین، سے لیکے گویوں تک کے حالات محفوظ ہیں، صاحب کشف الظنون نے طبقات کا ایک علیحدہ عنوان قائم کرکے ان کتابوں کی فہرست درج کی ہے، جس سے اس سلسلہ کی وسعت کا کافی اندازہ ہو سکتا ہے، مسلمانوں میں طبقات و اسماء الرجال کا ذخیرہ بالکل نئی چیز ہے جو دوسری قوموں میں نہیں، اگرچہ مسلمانوں کی بدقسمتی اور بدمذاقی سے اس کا اکثر حصہ برباد و ضائع ہو چکا ہے، لیکن پھر بھی اسوقت تک جو کچھ موجود ہے، وہ بھی اُن کے فخر کے لئے کم نہیں۔

آغاز اسلام سے حضرت معاویہ کے عہد تک اہل اسلام اندرونی و خارجی انتظامات و استحکامات و دیگر مہمات امور میں مصروف رہے، علوم و فنون کی طرف توجہ نہ کرسکے، اسلئے تاریخ کی ابتدا جناب معاویہ کے زمانہ سے ہوئی جبمیں مسلمانوں کے لئے نسبتہً امن و اطمینان پیدا ہوچلا تھا، حضرت معاویہ کو تاریخی واقعات سے بہت دلچسپی تھی، اکثر بعد نماز عشاء بہر رات گئےتک آپ قدیم عرب و عجمی حکمرانوں کے حالات سیاسی واقعات اور لڑائیوں کے قصے سنا کرتے تھے، عبید بن شریہ نے جس کو زمانہ جاہلیت کے واقعات اور عرب و عجم کے اکثر معرکے یاد تھے، آپ ہی کے حکم سے عہد جاہلیت کے متعلق کتاب مرتب کی تھی، اس زمانہ میں زیاد بن ابیہ نے بھی ایک کتاب تالیف کی جس کا نام علامہ ابن ندیم بغدادی نے مثالب الانساب بتایا ہے، بعد میں ہشام بن عبد الملک کے حکم سے عجمی تاریخ کا پہلوی زبان سے عربی میں ترجمہ ہوا، یہ بقول علامہ شبلی سبسے پہلی کتاب ہے جو دوسری زبان سے عربی میں منتقل ہو کر آئی۔

اس کے بعد آنحضرتؐ کی سیرت، مغازی، اخبار جاہلیت، اور انساب عرب وغیرہ کے متعلق متعدد کتابیں لکھی گئیں ان میں عام طور پر مشہور ہے کہ سب سے پہلے سیرت و مغازی میں محمد بن اسحاق متوفی ۱۵۱ھ و موسیٰ بن عقبہ متوفی ۱۴۱ھ نے تالیفات کیں، لیکن کشف الظنون میں مذکور ہے کہ پہلے سیرت و مغازی میں عروۃ بن زبیر متوفی ۹۳ھ اور وہب بن منبہ متوفی ۱۱۰ھ نے کتابیں لکھی ہیں، بہرحال وہ محمد بن اسحاق و موسیٰ بن عقبہ نے لکھی ہوں یا عروۃ بن زبیر و وہب بن منبہ نے تالیف کی ہوں، ان میں سے ایک بھی کتاب آج کل نہیں پائی جاتی، موجودہ و مطبوعہ کتب میں سیرت ابن ہشام جو محمد بن اسحاق کی سیرت سے منقول ہے، سب سے پہلی تصنیف ہے اور یہ بارہا مختلف مطابع میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے مغازی میں محمد بن عمر واقدی کی تالیفات بھی مشہور ہیں ان کے علاوہ کلبی وغیرہ نے بھی مختلف عناوین پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔

علامہ شبلی نے الفاروق کے مقدمہ میں اس دور کے اُن لوگوں کی جنہوں نے آنحضرتؐ کی سیرت پر کتابیں

لکھی ہیں، ایک مختصر فہرست درج کی ہے جنمیں بعض نام حسب ذیل ہیں

سیف بن عمر الاسدی، معمر بن راشد کوفی، عبد اللہ بن سعد زہری، نصر بن مزاحم کوفی، ابوالحسن علی بن محمد مدائنی۔

فتوحات کے متعلق بھی کثرت سے کتابیں لکھی گئیں جنمیں فتوح المصر والمغرب لابن حکم متوفی ۲۵۷ھ و فتوح بیت المقدس اور فتوح البلدان بلاذری وغیرہ خاص حیثیت رکھتی ہیں، فتوح البلدان نہایت جامع وقابل وثوق کتاب ہے، ابوحنیفہ دینوری متوفی ۲۸۱ھ کی کتاب اخبار الطوال ہے جسمیں معتصم باللہ تک کے حالات لکھے گئے ہیں، فتح عجم کے واقعات نہایت تفصیل سے ہیں۔

تاریخ عام پر سب سے پہلے جس نے قلم اٹھایا وہ ابن واضح یعقوبی ہے، اس نے اپنی تاریخ کو دو جلدوں میں ختم کیا ہے، پہلی جلد میں یہود، ہنود، یونان، روم، اور فارس کے حالات جمع کئے ہیں۔ اور دوسری جلد میں ابتداء ظہور اسلام سے خلیفہ معتمد عباسی تک کے حالات تحریر ہیں، قریب قریب اسی زمانہ میں ابن جریر طبری نے بھی اس موضوع (تاریخ عام) پر مفصل و مبسوط کتاب لکھی ہے طبری متوفی سنہ ۳۱۰ھ نے اپنی کتاب میں ۳۰۲ھ ہجری تک کے حالات قلمبند کئے ہیں، بعد میں فرغانی نے بطور ضمیمہ کے ۳۱۲ھ تک کے حالات اور بڑھادئے، تاریخ طبری مع ضمیمہ فرغانی لنڈن میں طبع ہو چکی ہے۔

ابوالحسن علی بن حسین مسعودی متوفی ۳۴۶ھ مسلمانوں میں نہایت وسیع النظر مورخ گذرا، اس نے تاریخ میں بہت سی کتابیں تالیف کیں، لیکن آج کل سوائے مروج الذہب وکتاب الاشراف والتنبیہ کے اس کی تمام تالیفات نایاب ہیں علامہ نعمانی نے مسعودی کی تصانیف کے متعلق ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر اسکی تمام تاریخی کتابیں ملتیں، تو کسی اور تصنیف کی کچھ حاجت نہ ہوتی، علامہ کی اس رائے سے مسعودی کی تاریخ تصنیفات کی اہمیت کا کافی اندازہ ہوسکتا ہے۔

(۳)

تاریخی تصنیفات وتالیفات کا دوسرا دور ابن اثیر متوفی ۶۳۰ھ سے شروع ہوتا ہے، جسکو ہمارے خیال میں دور التلخیص کہنا زیادہ مناسب ہے، اس زمانہ کے مورخین نے زیادہ تر متقدمین کی کتابوں کی تلخیص واختصار ہی پر قناعت کی ہے، ابن اثیر کی کتاب الکامل میں جہاں تک واقعات مشترک ہیں، تمام تر طبری کا خلاصہ ہے، طبری کے بعد کے واقعات اور اندلس کے حالات کا البتہ ابن اثیر نے اضافہ کیا ہے اسی طرح ابوالفداء نے الکامل اور عمر بن الوردی نے تاریخ ابوالفداء کی تلخیص کی ہیں۔

ابن اثیر اور ابوالفداء کے علاوہ سمعانی، نویری اور سیوطی بھی اس دور کے خاص مورخ سمجھے جاتے ہیں۔

اس کے بعد آٹھویں صدی میں علامہ ابن خلدون نے فلسفہ کی بنیاد ڈالی، اصول درایت مرتب کئے، اور تاریخ کو سلاطین کی شان وشوکت، عظمت وجبروت کے دور از کار افسانوں سے پاک کرنے کے لئے متقدمین کے اصولوں کی پرزور

مخالفت کی اور تاریخ کی وہی تعریف قرار دی جو آجکل بھی قریب قریب مسلم ہے علامہ کے خاص الفاظ یہ ہیں۔

حقیقة التاریخ انہ خبر عن الاجتماع الانسانی الذی ہو عمران العالم وما یعرض لطبیعة ذالک العمران من مثل التوحش والتانس والاصناف والعصبیات التغلبات للبشر بعضہم علی البعض وما ینشاء عن ذلک من الملک والدول ومراتبہا وما ینتحلہ البشر باعمالہم ومساعیہم من الکسب والمعاش والعلوم والصنائع وسائر ما یحدث فی ذلک العمران بطبیعتہ من الاحوال۔

تاریخ کی حقیقت یہ ہے کہ انسانی اجتماع جس کا نام دنیا کی آبادی ہے اس آبادی کی بنیاد میں جو حالات عارض ہوتے ہیں مثلاً توحش تانس عصبیت اور انواع و اقسام کے آدمیوں کا باہم ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنا، اس غلبہ سے ملک اور سلطنتیں اور جو مراتب پیدا ہوتے ہیں انسان اپنے کاموں اور کوششوں سے کسب معاش علوم و صنعتوں میں جو خصوصیت پیدا کرتے ہیں اور اس آبادی میں حسب اقتضائے طبیعت جو باتیں ہوتی ہیں ان سب باتوں سے مطلع ہونے یا مطلع کرنے کا نام تاریخ ہے۔

علامہ نے تاریخ نویسی کے لئے جو اصول و ضوابط مقرر کئے ہیں انکو بھی ہم علامہ ہی کی عبارت میں نقل کرتے ہیں۔

یحتاج صاحب ہذہ الفن العلم بقواعد السیاسة وطبائع الموجودات واختلاف الامم والبقاع والاعصار فی السیر والاخلاق والعوائد والنحل والمذاہب وسائر الاحوال والاحاطة بالحاضر من ذلک وما بینہ وبین الغائب من الوفاق وبون ما بینہما من الخلاف وتعلیل المتفق منہا والمختلف والقیام علی اصول الدول والملل ومبادی ظہورہا واسباب حدوثہا ودواعی کونہا واحوال القائمین بہا واخبارہم۔

مورخین کو حسب ذیل امور کی ضرورت ہے، قواعد سیاست جاننا، موجودات کی طبیعت سے واقف ہونا، سیرت، اخلاق، عادات، طریق، مذہب اور تمام باتوں کے متعلق اقوام و مقامات اور زمانوں کے اختلاف سے باخبر ہونا، ان امور کی موجودہ حالت پر احاطہ رکھنا اور حاضر و غائب میں جو اختلاف ہو اسکو سمجھنا، ہر اتفاق و اختلاف کے اسباب تلاش کرنا، سلطنتوں اور مذاہب کے اصول کو پیش نظر رکھنا، ان چیزوں کی ابتدائی حالت پر غور کرنا، جن اسباب سے یہ سب باتیں پیدا ہوئیں انکو سوچنا، سرگرم گروہوں کے حالات و واقعات کا جاننا۔

یہی ہیں وہ اصول جنکی ایجاد کا فخر ابن خلدون کو حاصل ہے۔ ابن خلدون نے ان اصول و ضوابط کو تاریخ سے وابستہ کرکے تاریخ میں فلسفی حیثیت پیدا کردی اور طریق استدلال و تنقیح واقعات کا نیا انداز قائم کردیا ہے، مسلمان اس مایۂ ناز امام المورخین اور فلسفۂ تاریخ کے موجد پر جسقدر بھی ناز کریں کم ہے اسی طرح علامہ مقریزی بھی جو علامہ ابن خلدون ہی کا شاگرد ہے خاص مدح و ستائش کا مستحق ہے۔

علاوہ ملخصات و شروح وغیرہ کے مسلمانوں کی صرف اُن تاریخی تصنیفات و تالیفات کی تعداد جو کشف الظنون میں مندرج ہیں ۱۳۰۰ ہے اور طبقات و تذکروں وغیرہ کی کتابیں ان سے علیحدہ ہیں، اگر تمام تاریخی مصنفات کی فہرست تیار کی جائے، تو واللہ علم کتنے ہزار تک نوبت پہونچیگی، یہ ہیں ہمارے اسلاف کے علمی کارنامے جن سے ہم بے خبر ہیں اور یورپ کی ترقیوں کو دیکھکر انگشت بدنداں ہیں۔

سعید رزمی

مولودِ مسعود

رسول گرامی علیہ السلام

زمین کی وسعت آباد بھا یا لگو انسانی آبادی سے معمور تھیں، انسانی لوازم حیات کافی تعداد میں موجود تھے، سمندروں کی سطح پر موجوں کی دلربا روانیاں نظروں کو مائل صد تماشہ بنائے ہوئے تھیں، مرغزاروں کی سبز و شاداب وسعتیں نظر فریبی کا ایک ہوش ربا منظر پیش کر رہی تھیں، گلزار و گلشن کی چمن پیرائیاں قدرت کی روح پرور رنگینیوں کا ایک جنون ساماں مظہر تھیں، پھولوں کا نکھار ذوق سلیم کے لئے ایک وجد آفریں سماں بنا ہوا تھا، بلبلوں کے سامعہ نواز چہچہے اضطراب و بیخودی کا ایک مستی خیز پیغام تھا، نسیم صبحگہی کے نکہت بار، جھونکے مشام افروزی کا سامان بہم پہونچا رہے تھے، فصل بہار ان کی جلوہ فروشیاں، سوختہ سامانوں کی متاع زندگی تھیں، گویا شادابی و دلفریبی کی ایک جنت تھی جو سطح ارضی پر اتر آئی تھی، پھر اسپر ابر کی تراوش، برق کی چشمک اور شرار کا تبسم ایک طرفہ تماشہ تھا جو انسانی کیفیات کی جنوں انگیزیوں کو بڑھانے کا کافی سامان اپنے اندر رکھتا تھا۔

لیکن سطح ارضی کی ان تمام جلوہ باریوں پر بھی خونخوار انسان تھا جو اپنی فطری بہیمیت کے اثر سے مصروف تباہ کاری تھا، وہ اپنے خدا سے جسطرح دور تھا اُسی طرح وہ بنی نوع البشر سے بھی کچھ زیادہ مانوس نہ تھا، بلکہ تہذیب و شائستگی رحم و رافت، خلق و مروت، اور سلوک و مساوات کی جگہ، باہمی قتل و غارتگری اور فساد و برہمی سے ظلوم و جہول انسان اس ملکوتی پیشینگوئی کی تصدیق کر رہا تھا کہ "اتجعل فیہا من یفسد فیہا و یسفک الدماء" پس انسانی بہیمیت و درندگی اور قتال و خونریزی کے انسداد کے لئے ضرورت تھی کہ چند ما فوق الفطرت انسان آئیں جو اپنی غیر معمولی اور ملہمانہ قوتوں سے انسانی فساد و بربادی اور جدال و قتال نفسانیت و سرکشی کے اس تباہ کن سلسلہ کو ختم و نابود کر کے زمین کو امن و عافیت اور سکون و سلامتی کا گہوارہ بنا دیں، آخر کار یہ ما فوق العادت ہستیاں (انبیاء علیہم السلام) بھی مبعوث ہوئیں، اور انہوں نے انسانی صلاح و فلاح اور تہذیب و شائستگی کے آسمانی اصول و ضوابط پیش کئے، انہوں نے خود کو خدا کا برگزیدہ پیغامبر ثابت کرتے ہوئے اپنے الہامی انداز خطابت میں انسان کو تباہ کاری و خونریزی کی جگہ پیار و محبت لطف و سلوک اور خدائی پرستش و عبودیت کی امن اندوز دعوت دی، لیکن بے خبر و سرکش، انسان نے ان فرستادہ خدا افراد کو بھی جھٹلایا، اور اُن کی نبوت و رسالت، اور خلافت الہیہ سے کلیتہً اعراض کرتے ہوئے ایک مرتبہ خدائے جلیل و قادر کی علی الاطلاق قدوسیت و شاہنشاہی سے بھی انکار کر دیا۔

انبیاء جلیل القدر کی اس دعوت و رہنمائی سے انکار و اِبا کا نتیجہ ایک ہولناک تباہی کی صورت میں برآمد ہوا، جس نے آخر کار زمین کی تمام کشادگیوں کو گھیر لیا، کہیں آتش فشاں زلزلوں نے انسانی آبادی کا تختہ الٹ دیا، کسی جگہ سمندر کی تباہ کن طوفان خیزیوں نے انسانی جماعتوں کو غرق فنا کر ڈالا، کہیں قہر الٰہی سنگ باری و ژالہ باری کی صورت میں انسانی آبادیوں کو سپرد خاک کرنے لگا، کسی جگہ زمین کی تمام سیرابیاں اور روئیدگیاں خشک و برباد کر دی گئیں، اور انسان بھوک و پیاس کے عذاب الیم میں گرفتار ہو گیا، غرض فضاء ارض کی تمام آسودگیاں شرور و فتن کے ایک بھڑکتے ہوئے جہنم کدہ سے بدل دی گئیں، اور کوئی حصہ باقی نہ تھا جہاں امن و سلامتی کا وجود پایا جائے۔

بالآخر رحمت الٰہی مائل بہ رحم و انصاف ہوئی، اور اب منظور ہوا کہ ہلاکت و بربادی خسران و نقصان اور عصیاں و سیہ کاریوں کی تمام آلائشوں سے زمین پاک کر دی جائے، اور رحیم و رحمان خدا کی بادشاہت کا پر جلال تخت بچھا دیا جائے تاکہ انسان محبت و الفت اور سلوک و پیار کی ایک ایسی حکومت میں لے لیا جائے جہاں امن و سلامتی اور صلح و موانست کا عافیت اثر ماحول انسان کو راغب بہ غارتگری نہ ہونے دے، لہٰذا اس مبارک مقصد کے لئے اقطاع عرب میں خطہ حجاز کو یہ شرف و افتخار حاصل ہوا کہ اُسکی تمام انسانی گندگی دھو دی گئی۔ ریگ زار عرب میں ایک دلکش تموج پیدا ہوا، جو دیکھنے والوں کو دریائے نور کا سماں پیش کرتا تھا، خشک اور چٹیل وادیاں بے شمار روئیدگیوں سے مالا مال کر دی گئیں، فلک بوس پہاڑوں کو بھی سرسبزی و شادابی کا ایک دلکشا روپ دیا گیا، خشک چشموں کو حکم ہوا کہ وہ اپنی تمام سیرابیوں اور روانیوں سے کام لیں، گلزار حجاز کے کبھی نہ پھوٹنے والے درختوں کی ٹہنیوں سے بھی سرخ دار غوانی کلیاں چٹکنے لگیں، جنکی عنبر فشاں نکہت نے ساکنان حجاز کو مست و شاد کام بنا دیا کشت زار حجاز کی غیر مزروعہ زمینوں نے پیداوار کی ایک غیر محدود مقدار بہم پہونچائی جس کے ذریعہ فاقہ کشان حجاز کو قوت لایموت کی دماغ سوز فکر سے نجات حاصل ہوئی، باران رحمت کی بوجھل گھٹاؤں نے اپنی ترا وش سے مقدس شہر مکہ کی تمام کثافتوں کو دور کر دیا، غرض زینت و آراستگی کا جب تمام کام ختم ہو لیا تو اسلامیان عالم کی بے شمار عقیدتوں کے مسجود و مرکز شہر مکہ میں اُس مہبط اعظم و سطوت کبریٰ، کا ظہور عمل میں آیا، جو انسانی امن و سلامتی اور خدائی عشق و فریفتگی کا پیغام آخریں تھا، وہ خلق و مروت الفت و شفقت سخاوت و فیاضی کا اعظم ترین مجسمہ تھا، گو اُسمیں شجاعت و شہامت کے دبدبہ انگیز اوصاف موجود تھے، مگر وہ دشمنوں پر بے انتہا مہربان تھا، وہ حکومت و امارت میں شاہان لشکر کش پر غالب و حاوی تھا، مگر اُس کا تخت حکمرانی مسجد کا وہ خاکی فرش تھا جہاں شاہ و گدا برابر سے نشست حاصل کر سکتے تھے، اُسکی دولت و فراغت کے لئے زمین اپنے لاتعداد خزانے پیش کرنے کو تیار تھی مگر اُس کے پاس باندازہ قوت لایموت بھی سرمایہ نہ تھا کہ وہ غنی تھا خدائے پاک و بے ہمتا کی محبت سے وہ شوکت و حشمت و جاہ، کا ذی وقار نمونہ تھا۔ مگر مسائل عامہ میں ایک وحشی بدوی بھی اُس سے خطاب و سوال کی جرأت کرتا تھا اور وہ حقوق عباد کے اس

احتساب و محاسبہ کی مساویانہ جرأت سے خوش ہوتا تھا۔ غرض انسانی حیات و زندگی تہذیب و شائستگی سے لیکر تمدن و معاشرت اور شاہانہ اصول کار کے تمام مدارج میں اُس نے یہی کیا کہ اپنی عملی زندگی کا ایک مقدس و قابل تقلید نمونہ تمہارے سامنے پیش کیا۔ بس اگر تم حیات اجتماعی اور انسانی مسائل و معاملات کے ساتھ اُخروی نجات و سعادت کے طالب ہو تو آؤ کہ مُتقی رسول گرامی روحی فداہ کی زندگی کا ہر ورق ایک عبرت آموز و حکمت اندوز سبق دیگا یہاں تک کہ تم اس اسوۂ اقدس پر چلکر کامیاب و کامگار ہو جاؤ گے۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۂ حسنہ

ملا رموزی توحیدی

غزل

اک آن میں بارونق اک آن میں ویرانہ
آئینۂ ہستی ہے میرا دل دیوانہ

اب دور میں ساغر ہے یا رقص میں دیوانہ
قربان ترے ساقی، پھر لغزش مستانہ

مخمور نگاہوں سے دل چور رہوا میرا
ٹکرا گیا مستی میں پیمانے سے پیمانہ

جھنکار ہے شیشوں کی یا ٹوٹے ہوئے دل ہیں
لوٹے لیے جاتے ہو تم رونق میخانہ

کس رند کی آنکھوں سے خونابۂ دل ٹپکا
نکلا لب ساغر سے اک نعرۂ مستانہ

کیا عرض تمنا ہو، دل تو ہی فنا ہو جا
وہ درد سے ناواقف، میں آپ سے بیگانہ

اعمال کی پرسش تھی، دیوانے پکار اُٹھے
ہو حشر تمنا بھی اے جلوۂ جانانہ

جل کر ہوا خاکستر پھر بھی نہ قرار آیا
اک شعلۂ مضطر تھا وہ دل پروانہ

ہر لفظ پہ سانس اکھڑے، ہر بات پہ دم نکلے
یوں درد محبت کا آغاز ہوا افسانہ

یہ وہم کی دنیا ہے، اک خواب پریشاں ہے
آباد ہے ظاہر میں در پردہ ہے، ویرانہ

یہ قبر اثر کی ہے، تم اُس سے نہ تھے واقف
کچھ وضع تھی رندانہ، کچھ طرز فقیرانہ

جعفر علیخاں اثر

جنگ عظیم نے مجھے کس طرح آزاد کیا

ایک پولینڈ کے باشندے کے قلم سے

مغربی یورپ کے آدمی اندازہ نہیں لگا سکتے کہ جنگ عظیم نے کیسا حیرتناک انقلاب بعض اقوام کی زندگی میں پیدا کردیا ہے، مغربی ممالک پر جو اثر ہوا ہے دیکھ کر اگر فیصلہ کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے، کہ جنگ عظیم کا نتیجہ صرف ابتری اور بد امنی ہے، اور اسنے یقیناً زندگی کو پہلے سے زیادہ دشوار کردیا، تاہم یورپ میں ایک ملک ایسا بھی ہے، جو اس جنگ کو اپنی نجات کا باعث سمجھ کر یاد رکھیگا، اور وہ پولینڈ ہے جو ہمیشہ اس جنگ کا ممنون رہیگا۔

اٹھارویں صدی کے اختتام پر پولینڈ کی خود مختار سلطنت پر جرمن، روسی، اور آسٹروی افواج نے حملہ کیا، اور اس کو تین حصوں میں تقسیم کردیا، اور ان حصوں کو حملہ آور حکومتوں نے اپنی اپنی سلطنت میں شامل کرلیا، پولینڈ یورپ کے نقشہ سے غائب ہوگیا۔ اور دنیا کی کسی طاقت نے اس تقسیم کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کی کیونکہ انصاف کا احساس یورپ میں مردہ معلوم ہوچکا تھا، ایک پولینڈ کا باشندہ ہمیشہ اسیری کے ان اکیسو بیس سال کو اپنی تاریخ کا نہایت تاریک صفحہ تصور کریگا،

ہم نے آزاد ہونے کی کوشش کی، ہم نے جان پر کھیل کر بار بار بغاوت کی، لیکن وہ کسطرح اسقدر طاقتور دشمن کے مقابلہ میں کامیاب ہوسکتی تھیں بلکہ ہر بغاوت کے بعد ملک پر زیادہ تباہی نازل ہوئی - ہمیں اجازت نہ تھی کہ عوام کے روبرو پولینڈ کی زبان میں گفتگو کریں، اور اپنے گھروں میں اپنی زبان کی کتابیں رکھیں، کوئی پولینڈ کا باشندہ سرکاری ملازم نہیں بن سکتا تھا، جب تک کہ وہ اپنی قوم سے غداری کا عہد نہ کرے، مخبر ہر جگہ شکار کی تلاش میں رہتے تھے، اور ہم اپنے گھروں میں بھی مطمئن نہ تھے،

اگر کسی پر شبہ ہوجاتا تھا، تو پولیس دن رات اس کے گھر کی نگرانی کرتی تھی، اور تمام کمروں، تمام صندوقوں، الماریوں بستروں حتیٰ کہ تصویروں کی چوکھٹوں تک کی تلاشی لی جاتی تھی، اکثر فرش کھود ڈالے جاتے تھے، دیواریں توڑ دی جاتی تھیں، اور گھر کو تباہ و برباد کرنے کے بعد یہ تفتیش ختم ہوتی تھی۔

لیکن کسکی ہمت نہ تھی کہ اس کے خلاف احتجاج کرے، بعض اوقات پولیس ایک باپ یا بیٹے کو لیجاتی تھی، مقدمہ کی کارروائی باضابطہ تو کیا، نمائش کے لئے بھی نہیں کی جاتی تھی، اور خاندان انکی صورت دوبارہ نہ دیکھ سکتا تھا، جب ہم سڑکوں پر پھرتے تھے تو ہمیں ہمیشہ ہوشیار رہنا پڑتا تھا۔ ہر لمحہ ایک شخص اس بات کا متوقع رہتا تھا کہ اب اس کے کان میں یہ نامانوس الفاظ پڑیں کہ " ہاتھ اٹھاؤ"

اور اگر اسنے ہاتھ نہ اٹھائے تو فوراً گولی اس کا کام ختم کردیگی، پولیس کا نمایندہ آتا تھا سب جیبیں ٹٹولتا تھا، اور اگر اتفاقیہ کوئی شخص پروانہ راہداری جس کا لیجانا ہر پولینڈ کے باشندے کے لیئے اپنے ملک میں لازمی تھا، بھول جاتا تھا، تو وہ فوراً حبس میں بھیجد یا جاتا تھا۔

روسی جیلخانے خاص طور پر ہمیشہ مکانیت سے زیادہ بھرے رہتے تھے، جیلخانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی، غریب اور بدبخت انسان اپنی مجبوری کی سزا میں تنگ وتاریک کوٹھریوں میں رکھے جاتے تھے، ان میں کھڑکیاں نہ ہوتی تھیں، ان میں سے بعض کے اندر پاؤں ٹخنوں تک مٹی میں دھس جاتے تھے، بعض اوقات انہیں صرف ایک اسٹول بیٹھنے کے لئے ہوتا تھا، اور کوئی بستر نہ ہوتا تھا، ایسی صورت میں اگر ایک تعداد قیدیوں کی دیوانہ ہوجاتی تھی تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی، بارہ تیرہ سال کی عمر کے بچے جن کا تنہا جرم یہ ہوتا تھا کہ اگر وہ اپنی زبان کی لکھی ہوئی کتاب یا نظم کو پڑھتے ہوے پکڑے جاتے تھے تو بہ ترین اوباشوں کے ساتھ مہینوں تک قید خانوں میں رکھے جاتے تھے، اور اگر الزام سخت سمجھا جاتا تھا، تو انہیں سائبریا بھیجدیا جاتا تھا،

ہزاروں پولینڈ کے ملزمین ایک پہیے کے ٹھیلے سے بعض وقت کئی سالوں تک اور بعض وقت عمر بھر سائبیریا کی کانوں میں کام کرتے رہے، انہیں سے بعض کو اجازت نہ تھی، کہ سطح زمین پر آسکیں وہ دن کی روشنی کبھی نہ دیکھ سکتے تھے، خوشگوار دھوپ ان کے جسم کو نہ لگ سکتی تھی، اور نہ تازہ دلکش ہوا میں وہ سانس لے سکتے تھے، میں ایک پولینڈ کی ضعیفہ سے واقف ہوں جو اب ستر سال کی بوڑھی خاتون ہیں۔ جنہوں نے پندرہ سال سائبیریا کی کانوں میں ملزمہ کی حیثیت سے گذارے ہیں۔ انکی کلائیوں میں اب تک زنجیروں کے نشان ہیں، حالانکہ اس زمانہ کو تیس سال گزر چکے ہیں، جبکہ انہوں نے پندرہ سال تک دن اور رات بلا ایک لمحہ آزادی ملے ہوے انہیں پہنے رکھا تھا۔

بیسویں صدی میں اس قسم کی باتوں کا یورپ میں واقع ہونا ناقابل اعتبار معلوم ہوتا ہے، لیکن چوتھی اگست سنہ ۱۹۱۴ء سے قبل تک زندگی کا یہی نقشہ پولینڈ میں نظر آتا تھا،

جس زمانہ میں کہ انگلستان کے بچے خوش خوش کھیلتے پھرتے تھے، اپنی زبان میں مسرت آمیز انگریزی گیت گاتے تھے اور انگریزی مدرسوں میں اچھے مفید اور شہری بننے کی تعلیم پارہے تھے، پولینڈ کے بچوں کو جبر واستبداد کے خوف وہراس سے فرصت نہ تھی، انہیں بھی اپنی زبان کے گیت عزیز تھے، لیکن انہیں ان کے گانے کی جرأت اس اندیشہ کی بنا پر نہ ہوتی تھی کہ کہیں دشمن نہ سن لیں، انھیں بھی اسباب کی تمنا تھی کہ اپنی زبان میں لکھی ہوئی کتابیں پڑھیں، لیکن وہ جانتے تھے کہ اس کا نتیجہ قید اور تکلیف ہے، اپنے ہمجولیوں سے وہ گفتگو نہ کرسکتے تھے، اس ڈر سے کہ مبادا انکی زبان سے ایسے الفاظ نکل جائیں جن سے شک وشبہ پیدا ہو، وہ جانتے تھے کہ مخبر انکی تاک میں ہیں، وہ جانتے تھے کہ وہ اپنے اسکول کے ساتھیوں

اور استادوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ روسی اور جرمن استاد اکثر اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ اپنے پولینڈ کے شاگردوں سے انکی خانگی زندگی کے حالات معلوم کرلیں اور اس اطلاع کو ان کے والدین کے خلاف کام میں لائیں۔

کیا یہ بات قابل تعجب ہے کہ پولینڈ کے بچے دوسرے ممالک کے ہم عمر بچوں کے مقابلہ میں زیادہ عمر والے معلوم ہوتے تھے، غیر ملکی اشخاص جو ہمارے ملک میں آتے تھے وہ ہماری بچوں کی آنکھوں سے سنجیدگی اور متانت ٹپکتے ہوئے دیکھکر تعجب کرتے تھے، لیکن چند بچے ایسے بھی تھے جو جرمن اور روسی حکمرانوں کے ظلم و تعدی کے باوجود غمگین نہ ہوتے تھے، روسی پولینڈ میں ایک چھوٹا لڑکا تھا جو سرحد کے قریب رہتا تھا، سرحد کی حفاظت روسی فوج کرتی تھی، اُسنے ایک شامہ (چڑیا) کو پولینڈ کا قومی گیت سیٹی کے ذریعہ سے بجانا سکھایا، جیسے ہی اسکے شاگرد نے گیت سیکھ لیا اُس نے آزاد کردیا، چڑیا جنگلوں میں یہ ممنوعہ گیت گاتی پھری کہ پولینڈ ابھی تک بالکل فنا نہیں ہوا۔ روسی سنتری نے اسے سنا اور جنگل میں اس ملزم کی تلاش میں گیا، لیکن اسکی کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔

روسی فوج کا پورا دستہ اس گستاخ مجرم کی تلاش میں جو زار کے احکام سے سرتابی کر رہا تھا، نکلا، اور اس نے تمام جنگل چھان مارا، سڑکوں کو بند کردیا، آخرکار وہ سراغ لگانے میں کامیاب ہوا اور مجرم ایک درخت کی شاخ پر اس بات کا اعلان کرتے ہوئے دیکھ لیا گیا کہ پولینڈ کو آزاد ہونا چاہیئے آخرکار یہ سرکش چھوٹا گویا اپنے الزام کی پاداش کو پہونچایا گیا، اور اسطرح روس اور زاریت کی ظلم و تعدی کی فہرست میں ایک اور بے زبان مظلوم کا اضافہ ہوا۔

جرمن پولینڈ میں بچوں کو مراحم خسروانہ کی بنا پر اجازت تھی کہ وہ اپنی عبادت اپنی زبان میں کیا کریں، لیکن سنہ ۱۹۰۶ء میں اسکی بھی ممانعت ہوگئی۔ دس ہزار اسکول کے بچوں نے اس حکم کے خلاف ستیاگرہ کیا، انہوں نے "ہمارا باپ" جرمن زبان میں کہنے سے انکار کردیا، جب عبادت کا وقت آیا تمام بچے اپنی جماعتوں میں ہاتھوں کو باندھے ہوئے اور صلیب پر جو استاد کے چبوترے پر لگی ہوئی تھی، نگاہ جما کر کھڑے ہوگئے، لیکن ان کے منہ سے ایک آواز بھی نہ نکلی، وہ اپنی زبان کی دعا اپنے دل میں مانگ رہے تھے، اور کوئی سزا انہیں کسی عزم سے باز نہ رکھ سکی، انہیں بید لگائے گئے، بعض کو اتنا مارا گیا کہ مر گئے، بعض کے والدین جیلخانے بھیجدیئے گئے، لیکن اسپر بھی انہوں نے نہ مانا۔

پولینڈ کے آدمیوں سے نجات پانے کے لیئے جرمنوں نے ایک اور قانون کا نفاذ کیا، کہ کسی باشندہ پولینڈ کو اجازت نہیں کہ وہ اپنی زمین پر بھی مکان بنا سکے، ایک کسان نیا مکان بنانا چاہتا تھا، اسکا پرانا مکان جل گیا تھا لیکن جب اسے مکان بنانے کی اجازت نہ ملی تو اس نے ایک بند گاڑی بنائی، جب پولیس اسکی تفتیش کو گئی تو اس نے کہا کہ میں نے مکان بنایا ہی نہیں بلکہ میں ایک گاڑی میں رہتا ہوں اس کے بعد ایک اور قانون کا نفاذ ہوا جسمیں ایسے مکان بنانے کی ممانعت

ہوگئی، "جسمیں آگ کھانا پکانے کے لیئے جلائی جاسکے"۔ پولینڈ کے باشندوں کو اپنی ذاتی زمین پر آوارہ گردانسانوں کی طرح بھی رہنے کی اجازت نہ تھی، لیکن اس سے بھی خراب ایک اور قانون تھا، جسکی بنا پر ہر جرمن کو یہ حق حاصل تھا، کہ پولینڈ کے باشندے کی زمین کو بلا اسکی رضا اور خواہش کے خرید کرے۔ اس قانون کا کوئی اپیل نہ تھا، پولینڈ کا باشندہ اس رقم کے قبول کرنے کے لیئے جو اسکی زمین، اور گھر کے معاوضہ میں دی جانے پر مجبور تھا، اور اُسے فوراً اس مقام سے دست بردار ہونا پڑتا تھا

لیکن باوجود اس سخت استبداد کے پولینڈ کے باشندوں کا اعتقاد غیر متزلزل رہا، تکالیف کے طویل ایام میں اپنے ارادوں میں مستقل رہے ہمیشہ انہیں یقین واثق رہا کہ ایک نہ ایک دن آرام و اطمینان نصیب ہوگا، اور انصاف کیا جائیگا،

آخر کار وہ دن بھی آیا، جنگ عظیم نے ایک نیا موقعہ اہل پولینڈ کو دیا، اگرچہ اس شب غم کی صبح طلوع ہوتے ہوتے اس ملک کو ناقابل بیان تکالیف اور صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں، ایسی تکالیف جو اس سے قبل پولینڈ نے کبھی برداشت نہ کی تھیں، پولینڈ کے باشندے روسی جرمنی اور آسٹریاوی افواج کے دوش بدوش لڑنے کے لئے مجبور کیئے گئے، بھائی کو بھائی پر گولی چلانا پڑی، بہت سی پولینڈ کی رجمنٹوں نے لڑنے سے انکار کردیا، اور پیچھے سے جرمنوں اور روسیوں نے انہیں گولی سے اڑادیا، گاؤں اور قصبے جلا کر برباد کردیے گئے، کھیت گولیوں کے انبار بن گئے، کوئلے کی کانوں میں پانی بھر گیا، اور تیل کے کھیتوں میں آگ لگا دی گئی۔ جنگ عظیم نے ہمیں آزاد کیا! اسنے ہمارے ملک کو آزاد کیا، ہم اب تک خیال کرتے ہیں کہ یہ سب خواب ہے۔ کیونکہ ایک ناممکن چیز واقع ہوئی ہے، ہمارے دشمنوں کی زبردست طاقت، روس جرمنی، اور آسٹریا کی مجتمع استبداد ٹکڑے ٹکڑے ہوکر گر پڑی، اور پولینڈ ایک دفعہ پھر آزاد اور خود مختار ہوگیا ہے پولینڈ کے تین حصے جو زبردستی ایک دوسرے سے جدا کردیے گئے تھے، اب پھر متحد اور یکجا ہو گئے ہیں، آج پولینڈ کے بچے اپنے خوش آیند گیت جتنے زور سے چاہتے ہیں گاتے ہیں۔ اور ہمارے مدرسوں میں پولینڈ کے استاد انہیں اپنی مادری زبان میں پڑھنا اور لکھنا سکھاتے ہیں۔ اب ہمیں مخبروں کا خوف نہیں ہے، اب ہم اپنی سڑکوں پر ڈر کر نہیں چلتے، ہر گوشہ خیال نہیں کرتے، مخبر، محبس اور تکالیف پہونچانے والے ہتھیار ایک ہیبت ناک سایہ کی طرح نگاہ سے روپوش ہوگئے، ایک نیا پولینڈ، ایک نئی دنیا میں دوبارہ پیدا ہوگیا ہے اور ایک ایسی نئی دنیا میں جسمیں اگر خدا کو منظور ہے تو قومیں امن و صلح کے ساتھ رہیں گی، اور اس قسم کے جرائم کا ارتکاب جیسا کہ پولینڈ میں [illegible] ہوگا۔

منور علی خاں (علیگ)

کرۂ زمین کے حالات

ہیئت

زمانہ قدیم میں سب سے پہلے زمین کی ہیئت کی طرف یونانیوں کا خیال ہوا اور انہوں نے اسے بیان کیا لیکن انکی رائیں مختلف تھیں، چنانچہ ہومیروس اور ہرسس کا بیان تھا کہ زمین ایک قرص کی مثل ہے، جس کا مرکز سرزمین یونان ہی اور اس قرص کے گرداگرد ایک نہر ہی، جس کا نام اوقیانوس رکھا تھا، انکا قول تھا کہ آفتاب اسی نہر سے طلوع ہوتا ہی اور اسی میں غروب ہوتا ہی، انکا یہ بھی خیال تھا کہ یہ قرص زمین ایک ستون پر قائم ہے اور آسمان کو ایک چادر قبہ تصور کرتے تھے اور کہتے تھے کہ رات اور دن، ستارے ہیں جن کو بدلی اٹھائے ہوئے ہے اور پہیوں پر گھوم رہے ہیں، بعض کا بیان تھا کہ قرص زمین ایک کشتی کی مانند پانی میں تیر رہا ہی، بعض کا قول تھا کہ زمین مسطح ہے جسکو ہوا اٹھائے ہوئے ہے، بعض کا خیال تھا کہ زمین مکعب ہے، غرض اسی طرح کے بہت سے خیالات وقیاسات تھے،

جب علم و حکمت کا زمانہ آیا اور ارسطو، سقراط، افلاطون جیسے لوگ پیدا ہوئے تو ان لوگوں نے زمین کا کروی ہونا ثابت کیا اور بیان کیا کہ زمین معلق ہے۔ فیثاغورث اور بطلیموس کا بھی یہی مذہب تھا، اور آجکل کے محقق بھی اسی قول سے متفق ہیں، علمائے اسلام نے بھی زمین کا کروی ہونا تسلیم کرلیا ہے اور قرآن حکیم کی بعض آیات جیسے زمین کا بسیط ہونا معلوم ہوتا ہے، انکی تاویل مفسرین نے یہ کی ہو کہ زمین چونکہ بظاہر مسطح و بسیط نظر آتی ہے اور شریعت اسلامیہ کا خطاب عموماً تمام طبقات بشر سے ہے اسلئے یہی مناسب تھا کہ ایسے الفاظ سے تعبیر و تصریح کی جائے جسے سب سمجھ سکیں۔

علامہ فخرالدین رازی نے تفسیر کبیر میں دلائل ریاضیہ سے زمین کا کروی ہونا ثابت کیا ہی، علمائے ہیئت کہتے ہیں کہ زمین دوسرے کواکب کی طرح ایک کوکب ہی اور چونکہ تمام کواکب کا کروی ہونا مشاہدہ سے ظاہر ہے اسلئے زمین کا بھی کروی ہونا لازمی ہے، چنانچہ خسوف کے وقت چاند میں زمین کا سایہ گول نظر آتا ہی، پہاڑ اور ٹیلے زمین کی کرویت میں خلل انداز نہیں کیونکہ مساحت سے دریافت ہوا کہ کرۂ زمین کا دائرہ چوبیس ہزار میل ہی اور یہ پہاڑ وغیرہ ایسے ہیں جیسے انڈے پر کوئی ذرہ چپکا دیا جائے۔

زمین میں قدرت نے مقناطیسی قوت بدرجۂ اتم ودیعت رکھی ہی جو ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے، مخلوق اسطرح زمین پر آباد ہے کہ ایک طرف کے باشندے دوسری طرف کے باشندوں سے معکوس ہیں، اسی قوت جر ثقیل نے اپنی طرف کھینچ رکھا ہے اور یہی قوت مقناطیسی گرنے نہیں دیتی، اور چونکہ زمین ایک بے انتہا فضا میں ہے اور وہ فضا ہر طرف سے برابر اوپر ہی کی جانب نظر

آتی ہے، اسلئے ہر سمت کے باشندے اپنے اوپر ہی آسمان دیکھتے ہیں۔ الحاصل زمین بے انتہا فضا میں گھوم رہی ہے اور بجز دست قدرت اسکو کوئی چیز تھامے ہوئے نہیں۔

حرکت زمین بادی النظر میں زمین کا متحرک ہونا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں زمین متحرک ہے، ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ آفتاب صبح کے وقت مشرق سے نکلتا ہے اور بتدریج بڑھتا ہوا بالکل ہمارے سر پر آجاتا ہے، اور پھر رفتہ رفتہ ڈھلتا ہے یہاں تک کہ ہماری نظر سے غائب ہو جاتا ہے اسی طرح ماہتاب اور دیگر ستارے، پس اگر یہ کہا جائے کہ زمین ساکن ہے اور ستارے اسکے گرد گھوم رہے ہیں تو یہ ہماری نظری غلطی ہے، جب ہم ریل میں سفر کرتے ہیں تو ہزاروں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد بھی خود کو اسی جگہ پاتے ہیں، جہاں سفر شروع کرتے وقت بیٹھے تھے یعنی ریل میں، اگر پہیوں کی گڑگڑاہٹ اور حرکت ہمیں محسوس نہ ہو تو ہم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ ریل چل رہی ہے یا ٹھہری ہوئی ہے، ساتھ ہی جب ہم باہر کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے کا میدان چکر کھا رہا ہے، اور تار کے ستون، درخت، پہاڑ، پل، دیوار اور مکان وغیرہ دوڑتے ہوئے نہایت سرعت کے ساتھ ہمارے قریب تر آتے ہیں اور سامنے آتے ہی بہت تیزی کے ساتھ پیچھے کی طرف چلے جاتے ہیں، اس حالت کو دیکھکر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ریل ساکن ہے اور میدان چکر کھا رہا ہے اور تار کے ستون، درخت، پہاڑ، پل، دیواریں، اور مکان وغیرہ متحرک ہیں اور دوڑ رہے ہیں۔

مصطلحات و تعریفات زمین کی حرکت دولابی حرکت کی مانند ہے، حرکت دولابی اسکو کہتے ہیں کہ کوئی شئے خود اپنے ہی گرد گھومتا رہے، مثلاً ایک گیند میں لمبی سوئی ڈالدیں اور گیند کو انگلیوں سے پھرائیں تو جو حرکت اس کے پھرنے میں پیدا ہوگی اسکو حرکت دولابی کہیں گے۔ اس گیند میں جو سوئی ڈالی جائے اسکو میل کہینگے، اور جن دو نقطوں میں سے یہ سوئی باہر کی جانب دکھائی دے اسکو قطبین کہیں گے، یہ سوئی گیند کے اندر جب اسکی ناف یا مرکز تک ہوپہنچیگی تو اس سے ایک خط مستقیم پیدا ہوگا، اس مرکز کو مدار یا محور کہتے ہیں، اگر اس گیند کی سطح پر ایک نقطہ لگادیں اور گیند کے گھومتے وقت اس نقطہ کو دیکھیں تو اس نقطہ سے گیند کی سطح پر ایک دائرہ نظر آئیگا، اسی طرح جتنے نقطے اس سطح پر ہونگے اتنے ہی دائرے نظر آئینگے، ان دائروں میں جو دائرہ قطب کے قریب تر ہوگا وہ سب میں چھوٹا اور جو دائرہ قطب سے دور تر ہوگا وہ سب سے بڑا معلوم ہوگا، اگر ہم اس بڑے دائرے کی جگہ سے گیند کے دو ٹکڑے کریں تو وہ دونوں ٹکڑے مساوی ہونگے، زمین میں چونکہ سوئی ڈالی نہیں گئی، اسلئے اس کا مدار یا محور فرضی نقطہ تصور کر لیا گیا ہے، اور وہ دونوں نقطے جن سے مدار یا محور پیدا ہوتا ہے، قطبین ہیں ان دونوں نقطوں کے علاوہ جتنے نقطے سطح زمین پر ہیں ان سے ایک دائرہ کی شکل پیدا ہوتی ہے، ان دائروں کا چھوٹا بڑا ہونا ان کے قطبین سے نزدیک تر یا دور تر ہونے پر موقوف ہے، جو دائرہ قطبین کے وسط حقیقی میں ہو وہی سب سے بڑا ہے اور اسی کو خط استوا

کہتے ہیں، یعنی یہ وہ خط ہے کہ اگر اس سے زمین کے دو ٹکڑے کر دئے جائیں تو دونوں حصہ مساوی ہوں گے، اسی خط استوا کا دور چوبیس ہزار آٹھ سو چھیانوے میل ہے، اور چونکہ زمین چوبیس گھنٹہ میں اپنا دورہ پورا کرتی ہے، خط استوا کا دائرہ اس عرصہ میں ۲۴۸۹۶ میل گھوم جاتا ہے اور جو دائرہ اس سے چھوٹا ہے اس کا دور کم ہوتا ہے، یہاں تک کہ قطب کے قریب تر جو دائرہ ہے وہ تقریباً چودہ ہزار چھ سو میل ہی گھومتا ہے،

رات و دن کی گردش اور تفاوت ساعات کا سبب زمین کی حرکت کے سبب رات اور دن کا ظہور ہوتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ طلوع آفتاب سے قبل آسمان پر ایک سفیدی نمودار ہوتی ہے اور بتدریج زیادہ ہوتی جاتی ہے۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔ پھر رفتہ رفتہ اسمیں سرخی اور زردی نمایاں ہوتی ہے اور بادلوں میں سرخی نظر آتی ہے، پھر رفتہ رفتہ وہ روشنی زیادہ ہوتی ہے، چونکہ اسوقت تک آفتاب افق نظری سے بہت دور ہوتا ہے، اس لئے ہمیں نظر نہیں آتا، اُسکی شعاعیں ہمارے بالائی طبقہ کو روشن کرتی ہیں اور اس کا عکس زمین پر پڑتا ہے اور بتدریج روشنی بڑھتی جاتی ہے، حتی کہ آفتاب ایک گیند کی مانند اچھلتا ہوا نکل آتا ہے، اور اس کے اچھلتے ہوئے شعاع جب اجسام پر پڑتے ہیں تو ان کا سایہ اول طویل نظر آتا ہے اسکے بعد جوں جوں آفتاب بلند ہوتا جاتا ہے، اُسکی روشنی بڑھتی جاتی ہے اور حرارت میں تیزی آتی ہے، سایہ اجسام چھوٹا ہوتا جاتا ہے، جب آفتاب پوری بلندی پر پہونچ جاتا ہے اسوقت اُسکی کرنیں زمین پر سیدھی پڑنے لگتی ہیں، اسی طرح غروب کا حال ہے۔

چونکہ زمین کروی ہے اسلئے تمام کرہ پر ایک ہی وقت میں دن یا رات نہیں ہوتے، بلکہ نصف کرہ پر دن ہوتا ہے اور نصف کرہ پر رات ہوتی ہے، زمین کے گھومنے میں جو نقطہ اسکا آفتاب کے مقابل آتا ہے، وہاں دن شروع ہوتا ہے اور جو نقطہ آفتاب کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے وہاں رات شروع ہوتی ہے، اسی وجہ سے ممالک مشرق و مغرب میں اختلاف مطالع واقع ہوتا ہے، مثلاً مدراس میں آفتاب طلوع ہوتا ہے تو بمبئی میں سپیدی صبح پیدا ہوتی ہے اور عربستان میں قریب تہائی رات ہوتی ہے، اور امریکہ میں کہیں رات شروع ہوتی ہے اور کہیں آدھی رات کے قریب ہوتی ہے۔

زمین کی گردش میں قدرت نے بڑی حکمت رکھی ہے، ہر روز قریب قریب دنیا کے تمام حصے اپنی اپنی باری کے مطابق گرمی اور روشنی پاتے ہیں اور یہ دونوں چیزیں یعنے گرمی اور روشنی، نباتات و حیوانات کی زندگی کے لئے ضروری چیزیں ہیں۔

ہوائیں زمین کی گردش میں قدرت نے ایک بڑی حکمت یہ بھی رکھی ہے کہ زمین کے گھومنے سے ہوا پیدا ہوتی ہے جو ہر ذی روح کی زندگی کے لئے ایک بالکل ضروری چیز ہے اور یہ خدا کی بڑی رحمت و مہربانی ہے کہ اُسنے ہواؤں کو نہایت افراط کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

کیا ہے۔

زمین ہمیشہ مغرب سے مشرق کی طرف گھومتی ہے، زمین کا وہ حصہ جو خط استوا پر ہے، ایک ہزار چالیس میل فی گھنٹہ مشرق کی طرف گھومتا ہے، جو ہوا زمین کے اُبھرے ہوئے حصہ کے سامنے سے پیدا ہوتی ہے، اُسکی رفتار بہت تیز ہوتی ہے، وہ ہوا میں ج قطبین کی جانب بہتی ہیں رفتار میں زمین سے سبقت لیجاتی ہیں۔

دن میں زمین کی گرمی نکلکر اُسکے اوپر کی ہوا میں آجاتی ہے، یہ ہوا اوپر کی طرف پھیلتی ہے، اور بہت اونچائی پر سمندر کی جانب بہتی ہے اسطرح زمین پر ہوا کا دباؤ گھٹ جاتا ہے، اور سمندر پر بڑھ جاتا ہے سمندر کی سطح کے قریب کی ہوا خشکی کی طرف بہتی ہے، رات کو یہ حالت برعکس ہوجاتی ہے، سمندر کے اوپر کی ہوا خشکی کے اوپر کی ہوا کی بہ نسبت زیادہ گرم ہوتی ہے، کیونکہ پانی گرمی کو آہستہ آہستہ نکالتا ہے یہ ہوا اوپر کی طرف بڑھنے لگتی ہے اور بہت اونچائی سے خشکی کی طرف چلتی ہے، اور زمین کے اوپر کی ٹھنڈی ہوا سمندر کی طرف زمین کی سطح کے برابر برابر بہتی ہے، جب سمندر اور خشکی کے اوپر کی ہوا حرارت میں برابر رہتی ہے اُسوقت سکون ہوتا ہے یہ حالت عموماً صبح اور شام کو ہوتی ہے۔

صبح کی ہوائیں بڑی روح پرور اور فرحت افزا ہوتی ہیں، ہم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا شکریہ ادا کریں، اُسنے اپنی رحمت کی نشانیوں میں سے ایک ہوا کو بھی پیدا فرمایا ہے، پانی اور ہوا ہر چیز کی حیات و نمو کے لئے ضروری ہیں۔

سمندر۔ بظاہر سمندر کا قریباً تمام حصہ بیکار معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں یہ بہت مفید اور ضروری چیز ہے، بارش کا پانی سمندر ہی سے آتا ہے اسکی کیفیت یہ ہے کہ سورج کی گرمی سے سمندر کا پانی بھاپ بنکر ہوا میں آجاتا ہے جب ہوا خشکی پر چلتی ہے تو اپنے ساتھ اُس بھاپ کو لے آتی ہے، اسی سے بادل بنجاتے ہیں اور پانی برستا ہے جو زمین کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ اُسپر نباتات اُگ سکے، اگر نباتات کو خدائے تعالےٰ پیدا نہ فرماتا تو حیوانات کی زندگی محال ہوجاتی، نباتات کا پیدا ہونا برسات پر منحصر ہے، بس ہر چیز کی زندگی پانی سے ہے، وجعلنا من الماء کل شئی حی۔

سمندر کا پانی قریباً ہر جگہ نمکین اور بعض جگہ بہت زیادہ کھاری ہے، سمندر کے پانی سے نمک بھی بنتا ہے، اور بعض جگہ سمندر میں شیریں پانی بھی ہے، اور دونوں پانی ایک ہی دریا میں ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے ذائقہ میں کوئی اثر نہیں کرتے، قدرت کی عجیب وغریب نشانیوں میں سے یہ بھی ایک نشانی ہے، مرج البحرین یلتقیان بینھما برزخ لا یبغیان۔

لہریں۔ عموماً اُس ہوا سے لہریں پیدا ہوتی ہیں جو پانی پر ٹکراتی ہے، سخت طوفان کے وقت بہت اونچی لہریں اٹھنے لگتی ہیں پانی بذاتِ خود آگے نہیں بڑھتا بلکہ اونچا نیچا ہوتا رہتا ہے، بہت زیادہ لہریں اکثر سمندر میں ڈوبے ہوئے آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے سے یا بحر اعظم کی تہ پر زلزلہ آنے سے پیدا ہوجاتی ہیں۔ زلزلہ کا سبب زمین کے اندرونی مادے ہوتے ہیں۔

مد وجزر مد وجزر خاص کر چاند کے ذریعہ سے اور کسی حد تک سورج کے ذریعہ سے پیدا ہوتا ہے زمین کی روزانہ گردش کے سبب بحر اعظم پر ہر جگہ مد وجزر دو دو روزانہ ہوتے ہیں۔ اتھلے پانی میں مد وجزر کے درمیان میں کبھی کبھی پچاس فٹ کا فرق ہوتا ہے اور بحر اعظم کے وسط میں لہر قریب چار فٹ کے بلند ہوتی ہے۔

خشکی اور پانی کرۂ زمین خشکی اور پانی میں تقسیم ہے اسمیں قریب ایک چوتھائی حصہ خشکی اور تین چوتھائی حصہ پانی ہے، خشکی کے بڑے حصے بر اعظم کہلاتے ہیں اور پانی کے بڑے حصوں کو بحر اعظم کہتے ہیں۔

سب سے بڑا بر اعظم ایشیا ہے اسکے بعد وسعت کے لحاظ سے افریقہ ہے، یورپ جو اصل میں ایشیا کا صرف ایک حصہ ہے ایک چھوٹا بر اعظم ہے، یہ تینوں ملکر ایک بڑا جزیرہ بناتے ہیں، جو بحر اعظموں سے گھرا ہوا ہے، ایک اور بھی بہت بڑا جزیرہ ہے جو ایشیا سے شمال میں قریب قریب ملا ہوا یہ امریکہ ہے جو دو بر اعظموں میں منقسم ہے، ایک شمالی امریکہ ہے دوسرا جنوبی امریکہ، دو اور بھی بر اعظم ہیں۔ ایک آسٹریلیا جو ایشیا کے جنوب میں ایک جزیرہ ہے، اور دوسرا انٹارکٹکا (ہے جو قطب جنوبی کے گرد ایک غیر آباد ویرانہ ہے۔)

بحر اعظموں کی تعداد بھی پانچ ہے، ایک اٹلانٹک ہے جو یورپ اور افریقہ کے مغرب میں ہے، اور دونوں امریکہ سے علیحدہ کرتا ہے، دوسرا بحر الکاہل ایشیا اور امریکہ کے بیچ میں ہے، تیسرا بحر ہند ہے، جو آسٹریلیا اور افریقہ کے درمیان ہے، چوتھا بحر جنوبی بر اعظم انیٹارکٹیکا کے گرد ہے، اور پانچواں بحر شمالی ہے جو سب سے چھوٹا ہے، قطب شمالی کے گرد پھیلا ہوا ہے،

ایشیا، افریقہ، امریکہ، آسٹریلیا، اور انٹارکٹکا بر اعظم ہیں، اور بحر الکاہل یا بحر پیسفک، اطلانطک، یا بحر ظلمات، بحر جنوبی، بحر ہند، اور بحر شمالی یا بحر آرکٹک بحر اعظم ہیں۔

وآیۃ لہم الارض المیتۃ احیینٰہا واخرجنا منہا حبا فمنہ یاکلون وجعلنا فیہا جنٰت من نخیل واعناب وفجرنا فیہا من العیون لیاکلوا من ثمرہ وما عملتہ ایدیہم افلا یشکرون۔

کشاف

سجدۂ نیاز

دنیا کے چند مکروہات کے متعلق بعض افکار میرے دماغ کو پریشان کر رہے تھے، میرا قلب مضطرب تھا، میری روح بے چین تھی، اور میرے دماغ میں بہت سے فاسد خیالات کا ہجوم تھا،

میں اسی ہجوم افکار میں پژمردہ اور مغموم شکل بنائے ایک چشمہ کے کنارے پر ایک سرسبز پہاڑی کے دامن میں کھڑا تھا، میرا ضمیر اسوقت بالکل خاموش تھا، میرے قلب میں روح لطیف افکار سے مغلوب ہو کر پست ہو گئی تھی، بظاہر میں دیکھ رہا تھا لیکن چشم بصیرت بند تھی، میں سُن رہا تھا، لیکن گوش ہوش بیکار تھے، میں سراپا جمود تھا

فطرت میری لایعنی افسردگی پر ہنس رہی تھی، پُرنم سبزہ میرے قدموں کے نیچے لوٹ رہا تھا، آسمان پر بادلوں کی ہلکی ہلکی دخانی چادریں رقص کر رہی تھیں، ہوا اُن کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

میری داہنی جانب کچھ فاصلہ پر ہلکا ہلکا ترشح ہو رہا تھا، پانی کے قطرے موتیوں کی طرح برس رہے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ آسمان نے عروس ارض کو سبز لباس پہنا کر تار میں موتی پرونے کا ارادہ کیا ہو، یکایک بادلوں کا ایک ٹکڑا آفتاب کی جانب سے آہستہ آہستہ اٹھا، اُس کی شعاعیں ایکدم زمین پر پھیلیں، یہ اُس سبزپوش دلہن کی رسم رونمائی تھی، آفتاب نے اس رسم کا حق فوراً ادا کر دیا۔ زریں شعاعوں نے پانی کے شفاف قطروں سے ملکر فیض انجذاب سے رنگوں کی ایک دنیا پیدا کر دی، قوس قزح کا خوبصورت ہار عطا ہوا۔

فطرت اپنی حسین ترین چیز اور دلکش صنعت پیش کر رہی تھی، لیکن میں اسوقت ذوق نظر سے محروم تھا، میری روح کے تمام لطیف عناصر غیر متحرک تھے، میں اس انتہائی دلفریب نظارہ میں بھی کوئی حسن محسوس نہ کر سکا۔

آبی پرند چشمہ سے تھوڑی دور پر پانی کے ایک اجتماع پر اڑ رہے تھے، بعض کنارہ پر بیٹھے پیاری پیاری آوازوں میں چہک رہے تھے، جن کے دلکش نغموں نے پانی کی لہروں کو متحرک کر دیا تھا، بعض پرند پانی کی سطح پر لہروں سے کھیل رہے تھے جو کبھی پانی کے عمق میں جا کر اپنی ہمجولیوں کی نظروں سے غائب ہو جاتی تھی، اور جب دوسری اُسکی تلاش میں غوطہ لگاتی تو وہ دوسرے رخ پر کچھ دور پھر اچھل آتی تھی، یہ ایک تفریح بخش کھیل تھا جو یہ دریائی مخلوق کھیل رہی تھی۔ بگلا عجیب متانت کے ساتھ پانی کے کنارہ پر بیٹھا تھا، مگر اُسکی متانت بھی شوخی آمیز تھی، وہ چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کی تاک میں تھا، یہ اُس کا شکاری کھیل تھا۔ مادر فطرت اپنے

معصوم بچوں کے ان سب کھیلوں کو پسند کرتی ہے۔

فطرت کی یہ نیرنگیاں لامتناہی سلسلہ کے ساتھ جاری تھیں، لیکن افسوس ہے کہ مخلوقات کی اشرف اور عزیز ترین ہستی اس خوشنما منظر سے کوئی لطف نہیں اٹھا رہی تھی، وہ اپنی خود ساختہ دنیا الگ بنائے ہوئے تھی، فطرت کا ہر ذرہ اپنے حسن سے اُسے متاثر کرنا چاہتا تھا لیکن آہ! وہ اپنی خیالی دنیا کے مکروہات میں گرفتار تھی،

مغرب سے ہوا کی سنسناہٹ کے ساتھ گہرے بادلوں کا ایک اور سلسلہ شروع ہوا، آفتاب کی روشنی اور کم ہو گئی، مطلع ابر آلود ہو کر تاریک ہو گیا، میں نے گرج کی مہیب آواز سنی اور بجلی نے ایک مضطربانہ انداز سے تڑپ کر تھوڑی دیر کے لیئے میری نظروں کو خیرہ کر دیا۔

میں فطرت کی ان آہنی اور دیو پیکر قوتوں کا مقابلہ اپنے طوفان تخیل میں محو ہو کر نہیں کر سکتا تھا، میں فضائے لطیف میں اس مہیب تغیر کو دیکھ کر چونک پڑا۔

میرے خیالات کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا، میں اپنے وجود کو اپنی بیگانہ وشی کو محسوس کر رہا تھا، میں اب تک اُس ماحول کے تمام مظاہر فطرت سے ناآشنا تھا، فطرت کا ہر ذرہ متحد تھا، تمام موجودات میں ہم آہنگی تھی، لیکن میں تنہا تھا، میرا ضعیف قلب رعد کی مہیب آواز سے لرز گیا، میرا ہر رُواں کانپ گیا، میرے تمام روحانی قوا متحرک ہو گئے، میرا ضمیر بیدار ہو گیا۔ جب حسن فطرت کی تمام ناز آفرینی اس معصوم انسان کو متاثر کرنے سے قاصر رہی تو عناصر کی خوفناک قوتوں کے مظاہرہ نے ایک لمحہ میں اس کے کان کھول دیئے یہ اپنے ہوش میں آ گیا، اسے معلوم ہو گیا کہ اب تک فطرت کا باغی تھا، وہ خالق عالم کی ہزارہا نعمتوں کا ناشکر گزار تھا۔

ہوش آتے ہی مجھے احساس ہوا، کہ نماز عصر کا وقت جا رہا ہے اور میرا فرض عبودیت قضا ہونے والا ہے، میں نے چشمہ کے صاف اور فرحت بخش پانی سے وضو کیا، جس کے بعد مجھے سکون حاصل تھا، رعد اب بھی اسی آواز کے ساتھ گرج رہا تھا، بجلی اُسی طرح بادلوں کی آہنی گرفت سے نکلنے کے لیئے مچل رہی تھی۔ چشمہ کا پانی اُسی ترنم نوائی کے ساتھ بہہ رہا تھا، دریائی پرند اپنی اپنی جگہ خاموش تھے، اب اُن کا کھیل ختم ہو گیا تھا۔ میں نے ایک مصفا پتھر پر کھڑے ہو کر انتہائے الحاح و عاجزی سے آقائے حقیقی کے سامنے اپنا سر نیاز جھکا دیا پہلا کلمہ جو میری زبان سے نکلا، اللہ اکبر، تھا، کائنات کا ذرہ ذرہ میرے الفاظ کی عظمت سے کانپ گیا۔ رعد اس کے بعد خاموش تھا، بجلی نے اپنی کشمکش بند کر دی تھی۔

میں امکانی حضور قلب کے ساتھ ارکان عبادت ادا کر رہا تھا، اپنے معبود کی عظمت اور اُس کے مظاہر قدرت کا احترام میرے قلب میں جاگزیں تھا، اسوقت میں ایک پیکر ادب تھا، میری نیچی نگاہیں اپنے قصور کا اعتراف کر رہی تھیں، میرا جھکا ہوا سر ندامت اور انفعال کے خیالات کا مظہر تھا، میرے قلب میں ایک قسم کا نورانی تموج محسوس ہوتا تھا، اور میری روح میں ایک خوشگوار انبساط ہو رہا تھا، جس کی حلاوت اور لطافت میرے وجود کا ہر رگ و ریشہ محسوس کر رہا تھا، میں بارگاہ نیاز میں سربسجود تھا، اور تکوین کا ہر ذرہ میرے ساتھ اعتراف عبودیت کر رہا تھا،

آبی پرند میری حالت کے اس فوری انقلاب پر متحیر تھے، ایک گم کردہ راہ ہستی جو ابھی چند منٹ پہلے اپنے کردگار کی تمام نعمتوں کو بے پروائی سے ٹھکرا رہی تھی، وہ فطرت سے باغی ہو کر اپنے خیالی عالم آرائیوں میں محو تھی، جبکہ کائنات کا ہر وجود اسکی حماقت اور اسکی محرومیت پر ہنس رہا تھا، قلب کی ایک جنبش اور خیال کی ایک تبدیلی کے ساتھ اپنے ماحول کی ہر چیز سے زیادہ دل آویز بن گئی وہ مظاہر فطرت جو ابھی اُسکی لغویت پر خندہ زن تھے، اب اُس کے احترام میں خاموش ہیں ۔

آہ یہی وہ بدقسمت ہستی ہے جو اشرف المخلوقات کہی جاتی ہے، جو بارگاہ رب العزت میں سب سے زیادہ گستاخ، لیکن سب سے زیادہ عزیز ہے، یہ ہی وہ وجود ہے جو اپنے تمام افعال کا مختار اور اپنے اعمال کا ذمہ دار بنایا گیا، اسی کے متعلق احسن تقویم کا ارشاد ہوا ہے، اور پھر اسی محروم مخلوق کے متعلق اسفل السافلین کی وعید ہے ۔

یہی وہ برگزیدہ ہستی ہے جو بعض اوقات ترقی کرتی ہے تو فرشتوں سے بلند ہو جاتی ہے، اور جب تباہی کی طرف گرتی ہے، تو اخلاقی پستی کے بدترین غار میں گروہ شیاطین کے ساتھ پھینک دی جاتی ہے ۔

خلوص و خشوع کے ساتھ چند منٹ کی عبادت سے جب میں فارغ ہوا تو میں ایک دوسری دنیا میں تھا۔ میری روح کا تمام انقباض رفع ہو گیا تھا، میرے دماغ کا تمام تکدر دور ہو گیا تھا، میری طبیعت میں گداز تھا اور میرا قلب مسرور ہو رہا تھا۔

میں صدق دل سے طالب عفو ہو چکا تھا، اسلیئے اب میں معصوم صفت تھا، آبی پرندے مجھے اب مانوس نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، میری اجنبیت دور ہو گئی تھی۔

میں مطمئن قلب کے ساتھ سبزہ زار میں ٹہل رہا تھا، پُرنم سبزہ میرے احترام میں خود بخود زمین پر بچھا جاتا تھا، پرندوں نے باریک سُروں میں اپنی نغمہ سرائی پھر شروع کر دی، تہ آب کی پوشیدہ مخلوق بھی بلند آواز میں تسبیح و تقدیس کرنے لگی، طوفان رعد و برق اب کسی اور ماحول کی طرف منتقل ہو گیا، مطلع صاف ہوتے ہی سرخی شفق نمودار ہوئی، جس کا عکس پانی میں پڑ کر عجیب دل آویزی پیدا کر رہا تھا، ہوا میں اب خنکی پیدا ہو چلی تھی، آفتاب اپنی نرم و نازک شعاعوں کو سمیٹ کر غروب ہو رہا تھا، وہ سطح زمین

کے اس رخ پر اپنا فرض حرارت وضیا افروزی پورا کر چکا، اب وہ حسن کی کسی اور دنیا میں جلوہ آرائی پیدا کریگا۔

اطمینان قلب کے ساتھ مسرت روحانی کے یہ چند لمحات جو میسر ہوے میری زندگی کے سب سے زیادہ قیمتی اور خوشگوار لمحے تھے، میری چشم بصیرت اسوقت کھلی ہوئی تھی، میں تمام پیش نظر اشیاء میں ایک زندگی محسوس کر رہا تھا فضاے متحرک کی ہر حرکت ایک شیریں نغمہ کی طرح میرے لئے سامعہ نواز تھی، کائنات کا ہر ذرہ میرے لئے دلفریب تھا، فطرت ایک پیکر حسن تھی اور میں اُس کا پرستار، یہ سب اسلئے تھا کہ مجھے کچھ دیر کے لئے اطمینان قلب حاصل تھا۔

خوش قسمت ہیں وہ ہستیاں جنکو یہ لازوال اور بے بہا دولت مستقل طور پر حاصل ہو جائے، اور بد قسمت ہیں وہ وجود جو اس نعمت عظمیٰ سے محروم ہیں۔ کتاب فطرت جس کا ہر ورق دفتر صنعت کردگار ہے اور اُس کے اسرار رموز اُن محترم و پاکیزہ نفوس کے لئے کھلے ہوئے ہیں، جو خلوص عقیدت، قناعت، صبر و استقلال کی نعمتوں سے مالا مال ہیں، جن کا احساس صحیح اور ادراک اصلی ہے۔ لیکن مذہبیت، اخلاق، مجاہدہ نفس، اور تزکیہ قلب، غرض اس کسب کمال کے لئے راستہ کھلا ہوا ہے، اور میدان وسیع ہے، قدرت کا خزانہ جواہر ریزوں سے مالا مال ہے۔ صرف متلاشی حقیقت کی ضرورت ہے، وانظروا یا اولوا الابصار۔

محمود صدیقی (علیگ)

غزل

وہ کاش قتل کی حسرت مٹا رہے ہوتے
کسی کے زخم جگر مسکرا رہے ہوتے

بکھر کے رہ گئے گیسوے مشکبو ورنہ
دھوئیں کی طرح خدائی پہ چھا رہے ہوتے

مزا تو جب تھا کہ ان کو لگاؤ کچھ ہوتا
ہمیں وہ کھو رہے ہوتے کہ پا رہے ہوتے

یہ کیا کہ جلوۂ رنگیں ہے اور پردہ کی قید
وہ اپنے حسن کا سکہ بٹھا رہے ہوتے

نہ ہوتی نورؔ جو حالت خراب اس دل کی
تو تارے دیکھ کے کیوں مسکرا رہے ہوتے

نور کانپوری

لذتِ مطالعہ

اوقاتِ فرصت میں سے چند منٹ، یا چند گھنٹے مطالعہ میں گزارنا انسان کے لذائذ روحانی میں سے سب سے بڑی لذت ہی، یہ روحانی لذت اتنی جاذب، اور شیریں ہی کہ اگر کبھی مشغول مطالعہ شخص کو کسی بنا پر مطالعہ سے جبراً روک دیا جائے تو وہ اچانک طور پر درد واثر میں اس طرح ڈوب جاتا ہے، جیسے کسی ماں کی گود میں سے اُس کے جگر پارہ کو بے رحمی سے چھین لیا جائے۔

لیکن طریق مطالعہ کی ناواقفیت یا غلطی، اس لطیف شغل کی لذت سے انسان کو پورے طور پر متمتع نہیں ہونے دیتی عموماً لوگ مطالعہ کو ایک سرسری کام اور سطحی نظر اندازی سمجھے ہوے ہیں، کسی کتاب کی سطروں اور الفاظ پر سے نظر کا گذار دینا ہی گویا اُن کے لئے مطالعہ کی مکمل تعریف ہے، ظاہر ہے کہ اس طریق مطالعہ سے لفظوں کے معانی پر معاً ذہن میں تیار نہیں ہوتا اور جب معانی ہی سمجھ میں نہ آئیں تو لذت ایک طرف وہ مطالعہ ہی سراسر بیکار ثابت ہے،

بعض اصحاب مطالعہ کے اس طرح عادی ہیں کہ بلا استثنا کسی علم و فن کی کتاب پر دسترس پاتے ہی سب سے پہلے اسکی جلد کے حسن و قبح پر نظر دوڑاتے ہیں، پھر ٹائیٹل پیج ملاحظہ ہوتا ہے، بعد میں "بسم اللہ" شروع کرتے ہیں، اور سطر دو سطر پڑھنے کے بعد دو چار ورق لوٹ کر از سر نو پڑھنے کی ابتدا کر دیتے ہیں، اس مقام پر بھی صفحہ آدھا صفحہ پڑھکر پھر سو پچاس ورق اُلٹ کر پڑھنے لگتے ہیں، اور یہاں تک کہ اخیر صفحہ پر اُچٹتی ہوئی نظریں گرا کر کتاب ہاتھ سے رکھ دیتے ہیں، اور گویا مطالعۂ کتاب مکمل ہو جاتا ہے، اسی قسم کے مطالعہ سے فائدہ کے بجاے نقصان متصور ہی، وقت ضائع ہوتا ہے، غور و فکر سے بیزاری بڑھتی ہے، اور سطح بینی اور ناقص کام کرنے کی عادت پڑتی ہے، ہم اس طرح کے مطالعہ سے کتاب کے مصنف و مولف کے اُن بیش قیمت خیالات، محسوسات، اور علمی تجربات کو مطلق نہیں سمجھ سکتے، جنہوں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ صرف کر کے بہ ہزار دماغی کد و کاوش عمق ذہن سے نکال کر ہمارے فائدہ اُٹھانے کے لئے کاغذ کے صفحات پر نمایاں کیا ہے۔

بہت آدمی اور کاموں کی طرح پڑھنے میں بھی بہت افراط سے کام لیتے ہیں، اور بعض غیر ضروری جلد بازی کے پابند ہو کر کتاب کو ایک ہی وقت میں بسم اللہ سے تمت بالخیر تک پڑھ ڈالتے ہیں، اس طریقہ سے مطالعہ کا مقصد اعلیٰ فوت ہو جاتا ہے، کیونکہ قوتِ فکریہ اور ذہن کی استخراجی طاقت پر حد سے زیادہ دباؤ اور بار آپڑتا ہے اور جس طرح معدہ میں اسکی قوت منہضمہ اور ظرفیت سے زیادہ غذا اسے ثقیل ہو نیکر فساد اور خرابی پیدا کر دیتی ہے بعینہ اسی طرح اس نہج کے مطالعہ سے

مضار اور نقائص پیدا ہوتے ہیں۔ جو قوت مطالعہ کو کمزور اور بے مصرف بنانے میں زہر کی تاثیر رکھتے ہیں۔

بعض اصحاب کو پڑھنے کا یہاں تک "چوکا" ہوتا ہے، کہ وہ ضروریات زندگی کے اوقات منقسمہ بھی مطالعہ کی دیبی پر بھینٹ چڑھا دینے سے نہیں چوکتے اور یہاں تک کہ کھانے اور سونے کا وقت بھی بچکچائے بغیر نذر کر دیتے ہیں حالانکہ ایسا عمل فطرت سے کھلا ہوا اعلان جنگ ہے کیونکہ حیوانی زندگی کے لیئے کھانا اور سونا اسی طرح قطعی اور لازمی ہے، جیسے دن کے بعد رات کا ہونا۔ طرفہ تر یہ کہ جب ایسے اشخاص کو اُن کے اس بے اصول اور غلط طرز مطالعہ پر متوجہ کیا جاتا ہو تو وہ بیساختہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ:۔

"مطالعہ میں ایک ایسی پر سرور لذت ہو جسے مطالعہ کرنے والے ہی ادراک کر سکتے ہیں"

لاریب ان کا یہ بیان حقیقت واقعی سے خالی نہیں لیکن ہماری رائے میں دوسرے کاموں کی طرح اگر مطالعہ میں بھی افراط و تفریط سے کام نہ لیا جائے اور بہ تمثیل خیر الامور اوسطہا موضوع مطالعہ منافی اخلاق و فوائد معنوی نہ ہو، تو یہ شغل بہترین استغالات اور برگزیدترین لذات اور تسلیات میں سے ہے۔

موضوع مطالعہ کا تجویز کرنا اور پھر اُس پر کاربند ہونا بھی پڑھنے والے کے لیئے ایک بنیادی کام ہے، جس علم و فن سے انسان کو حقیقی دلچسپی و دلبستگی اور آویزش ہو یا جس علم و فن کی معلومات کو وہ اپنے لیئے ضروری، اور اپنی حالت کے مناسب سمجھے اُسے اُسی موضوع کی کتابیں انتہائی قوتِ مطالعہ کے ساتھ پڑھنی چاہیئں اور دوسرے تمام علوم و فنون کی کتب سے صرفِ نظر فرض عین ہے، مگر افسوس ایسی پابندی بہت کم لوگ کرتے ہیں، عموماً یہی وہ مشاہدہ ہے کہ لوگ بلا انتخاب ہر قسم کی کتابیں پڑھنے میں بے سوچے سمجھے اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے رہتے ہیں۔

کیا کوئی خوشی و خرمی اس سے بہتر و برتر ہو سکتی ہے؟ کہ انسان چند منٹ فراغت ذہن اور کشادگی ذہن کے ساتھ اپنا تھکا ہوا اور خستہ دماغ خوش آیند اور لطیف اشیاء کے مطالعہ سے لذت اندوز اور تازہ دم کرنے میں صرف کرے مطالعہ دراصل دماغ و روح کی غذا ہی، اور غذا کی طرح اس کے لیئے بھی ایک مخصوص وقت مقرر کرنے کی ضرورت ہو تا کہ مطالعہ کرنے والا اپنے اندر ایک اشتہائے کافی اور گرسنگی واقعی محسوس کر سکے۔

بعض آدمی اس زریں اصول پر بالکل ملتفت نہیں ہوتے، اور اسلیئے کہ محض کوئی کتاب پڑھ ڈالیں، اور بیرحمی سے عزیز وقت کا خون اپنے ہی ہاتھوں کریں بیساختہ پڑھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں اور ایک احتیاجِ دماغی اور ضرورتِ علمی یا بالفاظ دیگر ایک شدید اشتہا و گرسنگی سے مجبور ہوئے بغیر کتاب کو ایک سانس میں ہضم کر جانا چاہتے ہیں، مطالعہ کے اس طریق سے انسان کے دماغ کو کوئی لذت اور تقویت حاصل نہیں ہوتی بلکہ اعصاب دماغی پر ناقابل برداشت

وزنی بوجھ آپڑتا ہے جو دماغ کو اور بھی تھکا دیتا اور قوت زائل کر دیتا ہے۔

بہت سے ادیب و شاعر اور ارباب تحقیق و تتبع نے لذت مطالعہ سے بہرہ مند ہو کر اسکی ضرورت اور بھلائیوں پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ اکثر صاحب ذوق فلاسفر وسائل تلذذ و خوشحالی میں سے "لذت مطالعہ" کو بھی ایک وسیلہ قرار دیتے ہیں اور کتاب کو اس کے حصول کی شرط اولین سمجھتے ہیں، بے شک کتاب انسان کی صمیم ترین اور مہربان ترین دوستوں میں ہے، جو تھکنا، خفا ہونا، بے محبتی کرنا، بے رخی کرنا، بے وفائی کرنا، گویا جانتے ہی نہیں وہ ہر وقت اپنے وجود سے انسان کی معلومات بڑھانے، روحانی سرور بہم پہونچانے، دماغی طاقت میں اضافہ کرنے اور ذہن و فکر میں استعداد و وسعت پیدا کرنے کی بلا معاوضہ خدمات انجام دیتی ہے، اور انسان کی خدمت گزاری سے کبھی نہیں اکتاتی میں اپنے اوقات زندگانی میں سے وہ فرصت کے گھنٹے لذیذ ترین اور مفید ترین سمجھتا ہوں، جنہیں ایک حقیقی ذوق و شوق اور سرگرمی کے ساتھ ایک ایسی نافع اور دلچسپ کتاب کے مطالعہ میں مشغول رہوں جو میری روح و دماغ اور قوت فکریہ کو کثرتِ لطافت و پاکیزگی سے معمور کر دے۔

ہاتف بھوپالی

غزل

اُف وہی صورت مجھے وقفِ پریشانی کرے　　ساری دنیا کی نگاہوں کو جو نورانی کرے

کس طرح سے بچ سکے وہ خرمنِ ہستی بھلا　　جسپہ بجلی دن میں سو سو بار جولانی کرے

یاں گریباں تو کجا تارِ رگ جاں بھی نہیں　　اب جنوں کس بل پہ شوقِ چاک دامانی کرے

کون اُسکو آنکھ بھر کر دیکھ سکتا ہے کہ جو　　اپنے رعبِ حسن سے اپنی نگہبانی کرے

طالب دیدار لاکھوں ہیں اگر موسیٰ نہیں　　حسنِ جاناں جسقدر چاہے فراوانی کرے

جامۂ ہستی بھی جانِ زار پر باقی نہ ہو　　شوقِ عریانی یہاں تک چاک دامانی کرے

واردات مختصر حامد یہ میرے دل کی ہے
وہ کیا ہے دوست نے جو دشمن جانی کرے

ایڈیٹر

تو کہاں ہے؟

”کہتے ہیں تیرا مقام آنکھوں میں ہے، لیکن پتلیاں تو ہر دم تیری تلاش میں گردش کرتی رہتی ہیں۔“

”کہتے ہیں تیری جگہ دل میں ہے، لیکن دل تو ہر وقت تیری یاد میں دھڑکتا رہتا ہے۔“

”کہتے ہیں تو گلوں کی نازک پنکھڑیوں میں مخفی ہے، لیکن پنکھڑیاں تو چڑھتی ہوئی دھوپ کے ساتھ تیری تلاش سے مایوس ہو کر زرد پڑ جاتی ہیں۔“

”کہتے ہیں تو شبنم کے درخشاں موتیوں میں پوشیدہ ہے، لیکن شبنم تو تیرے لئے آنسو بہاتی ہوئی سورج کی کرنوں میں جذب ہو جاتی ہے۔“

”کہتے ہیں تو کوئل کی درد بھری موسیقی میں محفوظ ہے، لیکن کوئل تو شام کو اپنی فریاد ناکام سے تھک کر اپنے سیاہ پروں میں سر چھپا لیتی ہے۔“

”کہتے ہیں تو دریا کے سریلے نغموں میں نہاں ہے، لیکن موجیں تو ناکام ہو کر آخر ساحل سے سر ٹکرانے لگتی ہیں۔“

”کہتے ہیں تو گل بکف مرغزاروں میں تبسم ریز ہے، لیکن دامن مرغزار تو دوپہر کو آتشِ ناکامی سے جھلسنے لگتا ہے۔“

”کہتے ہیں تو شمع کے زریں تبسم میں پنہاں ہے لیکن خندہ شمع تو صبح دم سفید اشکوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔“

”کہتے ہیں، تو لالہ گوں شفق کی سرخی میں مستور ہے، لیکن شفق تو تیری یاد سے لبریزِ الم ہو کر شب کی تاریکیوں میں مخفی ہوتی جاتی ہے۔“

”کہتے ہیں تو درخشاں چاند کی ضیا ریز تنویر پاش ہے، لیکن قلب ماہ تو آتش فرقت سے جل جل کر داغدار ہو جاتا ہے۔“

”کہتے ہیں، تو چمکیلے تاروں کی تابش میں ضوفشاں ہے، لیکن تارے تو جھلملا جھلملا کر ٹپکتے ہوئے آنسوؤں کی مانند دن کی شورشوں میں روپوش ہو جاتے ہیں۔“

”کہتے ہیں تو رگِ گردن سے زیادہ نزدیک ہے، لیکن سازِ ہستی کا یہ تار تو تیری یاد میں نغمہ زائیاں کرتے کرتے ناکامی کے ایک جھٹکے سے پاش پاش ہو جاتا ہے۔“

”میں تیری تلاش میں ہر جگہ ناکام و نامراد ہوں، تو پھر اے مطلوب حقیقی، اے مقصود اصلی، تو ہی بتا کہ

”تو کہاں ہے“

رابعہ خاتون پنہاںؔ

سقراط

سقراط اُن بزرگ ترین ہستیوں میں تھا جس نے سچائی کے لئے ہزار ہا تکالیف اور مصائب کا نہایت جوانمردی اور بہادری سے مقابلہ کیا، یہاں تک کہ اسی مقابلہ میں جان شیریں تک کی پروا نہ کی۔

سقراط یونان کے دار السلطنت ایتھنز کا باشندہ تھا، یہ شہر اُس زمانہ میں علمی، سیاسی، تمدنی، معاشرتی لحاظ سے ایک نمایاں حیثیت رکھتا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ یونان صنعت و حرفت، علم و ادب، روشن خیالی، عالی دماغی، حکمت میں ایک ممتاز اور قابل رشک درجہ حاصل کر رہا تھا، سقراط ایک غریب خاندان سے تھا، سنہ ۴۶۹ قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ اسکی ماں دائی اور اس کا باپ ایک سنگتراش تھا، اسکی زندگی کے ابتدائی حالات سے ہمیں کافی واقفیت نہیں ہے، البتہ یہ ضرور جانتے ہیں کہ یونان کے اُس دور ترقی میں گذرا ہی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

سقراط نے جب ہوش سنبھالا تو آبائی پیشہ بت تراشی اختیار کیا اور اسمیں کمال حاصل کیا، اسکو علوم سے فطری مناسبت تھی، اُس زمانہ کے علما اور فضلا سے علوم حاصل کیا کرتا تھا، ایک جگہ اُس نے خود بیان کیا ہے:-

میں اپنے دوستوں کے ساتھ اُس خزانہ کو حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا، جو کہ زمانۂ قدیم کے علما ہمارے لئے اپنی کتابوں میں جمع کر گئے ہیں"

وہ اُس زمانہ کے علم ہندسہ، علم نجوم، سائنس اور فلسفہ میں کافی واقفیت رکھتا تھا۔ اُس کا قول تھا کہ سچائی حاصل کرنے کا اور خدا کو پہچاننے کا بہترین ذریعہ علم ہے۔

تقریباً چالیس برس کی عمر میں ایک ملکی حملہ میں سپاہیانہ شرکت کی، اور بھوک، پیاس، موسم سرما کی سختیاں اور رہرو شواری کا سب سے زیادہ تحمل سے مقابلہ کیا، اس حملہ میں اُس نے ایک جنرل کی جان بچائی اور وہ انعام جو وہ خود حاصل کر سکتا تھا اُسے دلوایا، ایک دوسری لڑائی میں سقراط نے پھر بہادری کے جوہر دکھائے، اس لڑائی میں اہل ایتھنز کو شکست ہوئی،

لیخز کا بیان ہے کہ اگر سقراط کی طرح اور سب لوگ لڑتے تو شکست فتح سے بدل جاتی۔ ایک تیسری لڑائی میں بھی شریک ہوا اور اس مرتبہ بھی نہایت بہادری سے اپنا فرض انجام دیا، اگرچہ اس لڑائی کے مفصل واقعات موجود نہیں ہیں، اپنے فرض کی انجام دہی میں سقراط ہمیشہ ثابت قدم رہا، ایثار نفس کے لئے سقراط ضرب المثل ہو

جس زمانہ میں سقراط اپنی غیر معمولی بہادری، مستقل مزاجی، اور ایثار نفس سے شہرت حاصل کر رہا تھا۔ ذلیل اور کم ظرف لوگ اُسکی جانب سے نفرت پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے،

یونان میں ایک عبادت گاہ تھی۔ لوگوں کا یہ عقیدہ تھا، کہ وہاں پر غیبی حالات معلوم ہوتے ہیں، لوگ جاکر آئندہ حالات کے متعلق سوالات کرتے تھے، ان سوالات پر ایک آواز سنائی دیتی تھی، جو اُن سوالات کا جواب ہوتی تھی۔

سقراط کا دوست ایک مرتبہ مع سقراط کے اس عبادت گاہ میں گیا اور سوال کیا کہ آیا سقراط سے زیادہ عقلمند کوئی شخص ہے، جواب آیا، نہیں، سقراط اس سے یہ مطلب سمجھا کہ وہ شخص جو سقراط کی طرح اپنے آپ کو عقلمند نہیں سمجھتا ہے حقیقت میں وہی عقلمند ہے، کیونکہ عقلمندی صرف خدا کے لیئے ہی ہے۔

اس الہام غیبی کی تعلیم دینا سقراط نے اپنا اہم ترین فرض سمجھا، سقراط پہلے اُس زمانہ کے اُن لوگوں کے پاس گیا، جو عقلمند مشہور تھے، اُن سے وہ کچھ سوالات کرتا تھا، اُنکی گفتگو سے صاف یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو عقلمند سمجھتے ہیں، وہ اس الہام غیبی کی تعلیم دیتا تھا اور سمجھاتا تھا، کہ خود کو عقلمند نہیں سمجھنا چاہیئے، خاکساری اور انکساری بہترین شے ہے، سقراط کی اس تعلیم سے وہ لوگ نفرت کرتے تھے، کیونکہ عقلمندی کا سرٹیفکیٹ اُن سے چھینا جاتا تھا، اسپر اُن لوگوں نے سقراط پر طرح طرح کے الزام لگائے، کوئی کہتا تھا کہ سقراط ملک کے نوجوانوں کو بگاڑتا ہے، خدا کے متعلق جھوٹی باتیں بناتا ہے، لڑکوں کو سکھاتا ہے کہ ماں باپ کی عزت نہ کریں، زمین اور آسمان کے متعلق نئے نئے فلسفہ مذہب کے خلاف جاری کرنا چاہتا ہے، ان وجوہ پر اُن لوگوں نے اسپر مقدمہ چلایا، مقدمہ میں قریب قریب تمام ایتھنز اُس کے خلاف تھا، مقدمہ میں اُسنے ایک صفائی نامہ پیش کیا جسمیں اُس نے نہایت اچھی طرح حقیقت واقعہ کا اظہار کیا، ایتھنز میں عدالت ایک جماعت تھی، اس جماعت میں شہر کے ہر فرقہ اور ہر خاندان کے نمائندے ہوتے تھے، کثرت رائے سے فیصلہ ہوتا تھا، سقراط نے اپنی صفائی نامہ میں سچائی کا اظہار اس خوبی سے کیا کہ تقریباً پانسو رایوں میں نصف کے قریب سقراط کے موافق پائی گئیں ۲۸۱ اُس کے خلاف اور ۲۴۰ اُس کے موافق تھیں، یعنی اگر صرف ۱۲ رائیں اور مل جاتیں تو وہ مقدمہ جیت جاتا، سقراط کو حقیقت میں اسقدر رایوں کی بھی امید نہ تھی، سزا، سزائے موت تجویز ہوئی، اور دنیا کے ایک بہت بڑے ناصح، عالم اور عقلمند کو حق بات پر زہر دیا گیا،

اُس کے دوستوں نے اُسے بہت مجبور کیا کہ رشوت دیکر ایتھنز سے بھاگ چلیں، اُس کے دوست اُس کے بچانے کے لیئے بیحد روپیہ صرف کرنے کو تیار تھے، اور وہ اسطرح موت سے بچ بھی سکتا تھا، لیکن اُس نے اس بے شرمی کو ہرگز گوارا نہ کیا، اور بخوشی زہر کا پیالہ نوش جان کیا۔ (ماخوذ)

انیس (علیگ)

ادب یورپ میں عورت کا مرتبہ

۱۔ عورت تاج آفرینش ہے (ہرڈر)

۲۔ عورت بہترین اور آخرین تحفہ آسمانی ہے (ملیٹن)

۳۔ عورت زمین کا فرشتہ، خدا کی ذات کا دلرباترین اور یکتا پرتو ہے، جو ہماری زندگی روشن کرسکتا ہے (الفونس دولامارتین)

۴۔ عورت ایک ایسی مخلوق ہے، جس میں لطیف ترین اور صمیم ترین فضیلتیں ودیعت کیگئی ہیں (جولسون)

۵۔ اے عورت! تو تقدیس و تعظیم کے لیئے پیدا کی گئی ہے۔ (ج۔ برو)

۶۔ عورت ایک ادقیانوس کے مثل ہے اسلیئے بہت ہلکے اور بہت چھوٹے دباؤ کی مقاومت نہیں کرتی، لیکن بخلاف ازیں تمام وزنی سے وزنی بوجھ بآسانی اٹھالیتی ہے (راموس نیلسن)

۷۔ اے عورت! بیشک، تو فرشتہ ہے، لیکن چونکہ آزاد نہیں ہے، اسلیئے فرشتے سے بھی بالاتر ہے۔ (اترہ ج)

۸۔ عورت خلقت کے بھیدوں کا مخزن ہے (زکارلی کورتزکو)

۹۔ عورت نیکی کا ایک ایسا فرشتہ ہے جو ہمارے بچپن میں ہماری پوجا کرتی ہے، جوانی میں ہمیں خوش کام بناتی ہے، اور بڑہاپے میں ہمیں تسلی اور سہارا دیتی ہے۔ (آرہ ہیتین)

۱۰۔ عورت میری زندگی کی سب سے محبوب اور سب سے عزیز، اور سب سے مقدس ترین پرستش گاہ ہے۔ (ربلیس)

۱۱۔ عورت ہی وہ پہلا وجود ہے جو سب سے پہلے پاک عشق کی پاک حقیقت پہچانا (شیلر)

۱۲۔ عورت ایک ایسی مخلوق ہے جو ہمیشہ انتہائی گہرائی میں دیکھتی ہے بخلاف اسکے مرد سطح پر، اور دور تک دیکھنے کا عادی ہے، اس لیئے دنیا مرد کے لیئے ایک قلب ہے، اور قلب عورت کے لیئے ایک دنیا۔ (گرابہ)

۱۳۔ عورت دلربائی کا سربستہ راز ہے مگر اس راز کا دروازہ مقفل نہیں (نوالین)

۱۴۔ عورت ایک ایسا بھید ہے جو اپنے قلب کی گہرائی میں مادام الحیات ایسے ایسے اسرار پوشیدہ رکھتی ہے جن کا اظہار زبان کی طاقت سے باہر ہے۔ (ستوری)

۱۵۔ عورت میں ایک ایسی کشش ہے جسے ناقص عقلیں معلوم نہیں کرسکتیں۔ (زآلسیون)

۱۶۔ اے عورت تو آ! میں چاہتا ہوں کہ اپنی خودداری اور اپنی زندگی تیرے قدموں میں نثار کردوں (شکسپیر)

(ترجمہ)

اڈیٹر

"شعلۂ محبت"

خورشید جمال! علی الصباح خواب گاہ سے اُٹھکر رفیق سہیلی "شاما" کے ساتھ باغ کی نزہت خیز روشوں پر ٹہلنے کے لئے آنکلی، اُسکے رخسار رنگیں کی نظر فریب شادابی دیکھکر عنادل دھوکے میں آگئیں، اور چہچہاتی ہوئی اُڑیں، آفتاب کی بزم زور لطیف شعاعیں اُسکے ملاحت بیز حسن میں جذب ہونے لگیں، اُسکے دلربایانہ انداز خرام سے سبزۂ چمن پائمالی کے شوق میں لوٹنے لگا، اور اُسکے کرشمۂ وناز کو دیکھ کر مرغان چمن کی زبانوں پر بیساختہ آگیا۔

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست

بسیار شیوہ ہاست بتان را کہ نام نیست

نسیم سحری جو پھولوں کے سکراتے ہوئے لبوں سے شوخیاں کر رہی تھی، اُسکی نظر خورشید جمال کی تبسم آمیز لبوں پر پڑی، جہاں کہ رنگین لبوں کی فضا دُر دنداں کی ضوپاشی سے قوس قزح کی طرح نظر فریب بن گئی تھی، اور تبسم کے ساتھ ساتھ ایک روح پرور ہلکی سی صدائے شیریں نے قوت سامعہ کو بےچین کردیا،

اِس نظارۂ جاں نواز" نے اُسکو وجد میں ڈال دیا، اور صبا بیتاب ہوکر جھومنے لگی،

خورشید! اپنی رفیق سہیلی کا ہاتھ میں ہاتھ لئے ہوئے مرمریں حوض پر جلوہ افروز ہوگئی، حوض کا شفاف پانی یہ معلوم ہوتا تھا کہ برق کی ہتیں سیال صورت میں تحلیل ہوکر حوض میں لائی گئی ہیں۔

خورشید صبر شکن ادا کے ساتھ پانی کی طرف جھکی اور اپنے دلکش چہرہ کا عکس سطح آب میں اُسکو نظر آنے لگا۔

وہ اپنے دلربا عکس کا نظارہ فرط سرور سے کر رہی تھی، اور پانی میں خفیف لہریں عکس حسیں کو مرتعش کر کے اُسکو محو حیرت کر رہی تھیں، یکایک چھوٹی چھوٹی خوشرنگ مچھلیاں، اُسپر ٹوٹ پڑیں، اور تموج آب کی آغوش میں وہ انعکاس نورانی غائب ہوگیا۔

خورشید کی پُر حسرت نگاہیں تشنۂ رنگین اور اُس کا زاویۂ نظر صحن چمن کی جانب پھر گیا۔

ایک تتلی جس کے مخطط پروں میں سیکڑوں، خوشرنگ زردار چھوٹے چھوٹے نقاط تھے اور جسکے پروں کا سطح قرمزی رنگ کے مخمل سے مشابہ تھا، وہ پھولوں کی رنگین قبا بننا چاہتی تھی، اُسکو باد سحر کے ستم آمیز جھونکے نے ڈھکیل دیا پھر وہ سنبھلی اور اپنے سبک جسم کو نازک پروں پر لیئے ہوئے چاہتی تھی کہ اپنے مشتاق لبوں کو پھولوں کی نازک پنکھڑیوں پر رکھدے

کہ انھیں لمحات میں ایک ظالم چڑیا اپنی منقار میں اسکو اُٹھا کرلے اُڑی۔

ان سوز بخش نظاروں کا تلخ انجام اُسکی دلچسپیوں کو کم کردیتا ہے اور "شاما" اسکے احساسات میں تغیر پاکر پیانو سامنے رکھ دیتی ہے، اور وہ اپنی سہیلی کی خواہش پاکر اپنی خوشنما مخروطی انگلیوں کو ساز کے پردوں میں حرکت دینا شروع کردیتی ہے، صدائے نغمہ، جذبات کو اور ابھار دیتی ہے اور وہ دردبھری موسیقی کے ساتھ غالب مرحوم کی یہ دل گداز غزل گانے لگتی ہے۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

نغمہ و سرود کی اُن مسترکانہ صداؤں نے فضا میں ایک وجدانہ کیفیت پیدا کردی، وہ چاہتی تھی کہ کچھ ذوق نشاط حاصل ہوتا، مگر اندوہ افسردگی میں اور اضافہ ہوگیا، تھوڑی دیر کے بعد وہ پیکر حسن آتشیں اپنے محل میں چلی گئی۔

آفتاب ڈوب چکا ہے، اور شفق کی نظر فریب سرخی کو تاریکی کے گہرے نقاب نے چھپا لیا ہے، خورشید! اپنے پرتکلف کمرہ میں بیٹھی ہوئی ہے، جہاں مختلف رنگ کی قندیلیں لٹکی ہوئی ہیں۔ اور قمقمے نورپاشی کررہے ہیں، اور وہ اپنے تخیل کے آغوش میں تازہ اور شاداب مضامین کے گلہائے رنگیں پاکر مسرور اور مبتہج ہورہی ہے، اُسکے رشحات فکر کی کبھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ میر کی غزل پہ مصرع لگائے، اور کبھی اُس کا دل چاہتا ہے کہ تاثیرات حسن کے موضوع پر گلہائے فکر کی نکہت خیزیوں سے مشام عالم کو مبہوت کردے۔

وہ اپنی بلوریں پیشانی کف رنگیں پر لئے ہوئے غور کررہی ہے اور سامنے والے لیمپ کی شعاعیں شہابی حسن اور کف رنگیں سے مس کرتی ہوئیں منتشر ہورہی تھیں، اور ایک دل آویز عکس درودیوار پر پڑرہا تھا، اسی اثناء میں اُسنے دیکھا کہ سیکڑوں پروانے شمع کے شعلہ بار حسن پر ٹوٹ کر گرتے ہیں، اور وہ ناکام تمنا تودۂ خاکستر ہوجاتے ہیں۔

اس حسرت انگیز نظارہ نے جذبات کو بے قابو کردیا، اور اُن سوختگان محبت کے افسوسناک انجام پر نرگس شہلا میں آنسو بھر آئے، وہ حسن کی ان سفاکانہ بیرحمیوں پر بے انتہا متاثر ہوگئی۔

مضمون آفرینیوں سے اُس کا متخیلہ ہٹ گیا، اور اُسی عالم تاثر میں سیکڑوں شہیدان محبت کی روحیں، اُسکے سامنے آگئیں، کسی کی آنکھیں اپنے محبوب کے انتظار میں پھٹی ہوئی تھیں اور کسی کے قلب حزیں میں، جدائی کا تیر نیمکش چبھا ہوا تھا اور کوئی بے مہری اور بیدردی، ستم شعار، میں بے قرار تھا، وہ ان جگر خراش نظاروں میں گھر گئی اور عالم حسرت میں دیر تک ڈوبی رہی، یہاں تک کہ اُسپر غنودگی طاری ہونے لگی اور جو آنکھیں ٹکٹکی باندھے ایک طرف جمی ہوئی تھیں جھک کر

اور ان پر مژگان کا سیاہ نقاب پڑگیا۔

ابھی چند منٹ بھی نہ گذرے تھے وہ عالم رویا میں دیکھتی ہو کہ اُسکے بازوؤں میں نورانی شہپر لگے ہوئے ہیں اور فضاء سماوی میں پرواز کر رہی ہے، لطیف ہوا کے اہتزاز سے اُسکے سنہرے بال اُڑ رہے ہیں، اور چاند کی شعاعیں ان بالوں میں جب نفوذ کرتی ہوئی بہتی ہیں تو محدب مخروطی شیشہ کی طرح افق میں خوشنما رنگ کی لہریں پیدا ہوجاتی ہیں۔ **خورشیدا** ایتھر کی لہروں میں تیرتی ہوئی کرۂ ارضی سے دور نکل گئی ہے اور دنیا اُسکو ایک چمکدار ستارہ کی طرح نظر آرہی ہے۔

وہ آگے بڑھکر ایسے مقام میں داخل ہوگئی ہے، جہاں کی فضا انوار وتجلیات کے قمقموں سے منور ہورہی تھی اور نغمات قدس کی ترنم ریزیوں سے ہر چیز پر محویت کا عالم طاری ہورہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد خورشیدا ایسے درخت کے نیچے کھڑی ہوگئی جسکی شاخیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور اُسپر ہزارہا رنگ برنگ کی چڑیاں نواسنجیوں سے سامعہ کو حیرت میں ڈال رہی تھیں، انہیں حیرت خیز لمحات میں ایک زرد پتہ اُسکے سامنے گرا، اور اسکی آنکھیں اُسپر گڑگئیں، لیکن اسپر نورانی حرفوں میں "وحید" کا نام لکھا ہوا دیکھا، تو وہ حیرت انگیز غور میں ڈوب گئی، اور اپنے جی میں کہنے لگی کہ یارب میں کہاں ہوں! کہیں یہ شجر طوبےٰ تو نہیں، انہیں خیالات کی کشمکش میں مبتلا تھی، کہ ایک پتہ اور گرا، جب اُسپر اپنا نام لکھا ہوا دیکھا تو اسکی روحانی اذیت کی انتہا نہیں رہی اور اسی جاں فرسا کرب میں اُسکی آنکھ کھل گئی،

اس مہیب نظارہ نے اُسکے سکون کو فنا کردیا وحشت اور اضطراب نے حواس کا مربوط سلسلہ منتشر کردیا، وہ قلق انگیز تاثرات میں گھر گئی، اُس کا دماغ اسی تکلیف دہ نظارہ سے گھبرا اُٹھا، ابھی سکون ہونے نہیں پایا تھا، اور حواس میں ترتیب نہ آنے پائی تھی کہ دروازہ پر زور سے دستک ہوئی اور خادمہ نے لاکر ایک خط پیش کیا،

خورشید کی بدر نما پیشانی پر اندوہ و فکر کی تاریکی چھاگئی، بدحواسی کے ساتھ جلد جلد خط کھولا گیا، لکھا تھا،

جناب من!

کہا جاتا ہو کہ جلوہ حسن محبوب میں مقناطیسی اثر ہوتا ہو، جو مشتاقان کے تارہائے نظر کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے اور قلب کے گوشوں گوشوں میں اضطراب وبیقراری کا تشنج پیدا کردیتا ہے، چشم فسوں ساز میں لال لال ڈورے فی الحقیقت ارغوانی ریشم کے پھندے ہوتے ہیں، جو لستان حیات کے طائر رنگین کو گرفتار کرلیتے ہیں، اُن کی برش تیغ ادا دل وجگر کو بسمل کردیتی ہے، اور غمزہ وکرشمہ کی صاعقہ پر آشوب خرمن صبر وشکیبائی کو تودۂ

بنا دیتی ہے۔

لیکن اُف ایک چیز اور بھی ہے، جس سے دامانِ شکیب کی دھجیاں اُڑ جاتی ہیں اور جس سے اعصاب دماغی میں ہیجان عظیم برپا ہوجاتا ہے۔

ریڈیم کی نفوذ کرنی والی تیز شعاعوں میں وہ اثر نہیں ہے، جسقدر حسن کلام میں ہے۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد

بسا کیں دولت از گفتار خیزد

آہ تمہاری مضامین کی رنگ آمیزیاں جو قوس قزح کے مختلف والوان سے زیادہ نظر فریب ہوتی ہیں، نظمیں، اُن میں جذبات اور تاثرات کا تموج، خدا کی پناہ!!

کاش میں مختلف رسائل میں انکو نہ دیکھتا میں کچھ کہہ نہیں سکتا، آہ میری کائنات زندگی تباہ ہوگئی، اور میری رہ نوشباب کے تختے نامرادی کے سمندر میں غرقاب ہونے لگے۔ آہ اس شیفتگی کا نتیجہ یہ تھا کہ میرے تخیل نے ایک پیکر حسن کی تصویر "خورشید جمال" کے نام کی مناسبت سے حس مشترک میں کھینچ لی، اتفاقاً جب کسی رسالہ میں اُس کا کلام نظر آجاتا تھا، تو ایک وجدانی کیف میں محسوس کرتا تھا، اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ بطون دماغ میں وہی مجسمہ جمال، بانسری لیئے ہوئے گا رہا ہے

میں جسقدر ضبط کرتا گیا اُسیقدر اندر ہی اندر میرے ریشہ ہائے جگر میں آگ سلگتی رہی، اور محبت وعشق کی آتش سوزاں ملتہب ہوتی گئی، اور اُسکے اقتضاء فطری نے میرے ملبوسات صحت کو جلانا شروع کر دیا۔

اب میں اپنی زندگی سے مایوس ہوگیا ہوں، نشست برخاست کی طاقت سلب ہوچکی ہیں، ان آخری لمحات میں اس ناکام تمنا کی یہ تمنا باقی رہگئی ہے، کہ دم واپسیں نظارہ محبوب کرلوں۔

بہ لبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم

پس ازاں کہ من نہ مانم بچہ کار خواہی آمد

راقم

"سہیل"

خلاصہ تھا، شعلۂ جگر سوز تھا، جس نے روح کو آتش ریز کردیا، نگاہوں میں ارتعاش پیدا ہوگیا، نبضیں ساقط ہونے لگیں، شاداب بشرہ پر زردی چھاگئی، گلابی لبوں پر نیلاہٹ دوڑ گئی، دماغی قوی نے اپنے معمولات چھوڑ دیئے، اور ان سر میں تشنجی آثار پیدا ہونے

لگے، اور یہ ایک زہرہ گداز چیخ کے ساتھ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔

شاما بغلی کمرہ سے مضطربانہ دوڑی، دیکھا، کہ خورشید جمال فرش زمین پر پڑی ہوئی ہے، اُس کا شہابی چہرہ برف کی طرح سفید ہو گیا ہے، اور ملاحت کی بجائے چہرہ پر حسرت و بیکسی برس رہی ہے،

یہ قیامت خیز منظر دیکھکر گھبرا گئی، فوری مشمومات مفرح کا استعمال کیا گیا، بہزار دشواری اُس نے آنکھیں کھولیں، لیکن اسکے لبوں پر دردناک آہیں تھیں، آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔

شاما کمال منت اور التجا کے ساتھ دریافت کر رہی ہے کہ خورشید! للّٰہ بتاؤ کیا مزاج ہے؟ آخر لخت ہائے جگر کے ٹکڑے کیوں آنکھوں سے گر رہے ہیں، خورشید نے ایک سرد آہ لیکر کہا:۔

میری رفیق شاما، تمہاری خورشید کا تھوڑے سے وقفہ کے اندر خاتمہ ہونے والا ہے، آج صبح سے جن ہولناک نظاروں کا میں مشاہدہ کر رہی ہوں جو خوفناک خواب میں نے دیکھا ہے اُسکی تعبیر یہی ہے کہ میں ہمیشہ کے لئے تم سے جدا ہو جاؤں، اور یہ کہکر خط آگے بڑھا دیا۔

شاما خط دیکھنے لگی، اور دیکھتے ہی دیکھتے اُسکی پیشانی پر حسرت بیز شکنیں نمودار ہو گئیں، دماغ اندوہناک خیالات میں گھر گیا اور دل کا بوجھ قلب میں محسوس ہونے لگا، تاہم اُسنے توازن دماغی کو قائم رکھتے ہوئے، سکون آمیز پیرایہ میں کہا:۔

خورشید جمال! میں نہیں سمجھ سکتی کہ تمہارے ادراکی قوتے مسحور کیوں ہو گئے ہیں اور تم نے اپنے خودداریانہ وقار کو کیوں مغلوب ہونے دیا ہے، وہ حسیات جو ہمیشہ تمہارے قابو میں رہی ہیں آج کیوں بے قابو ہو رہی ہیں، یہ کیا ہو گیا ہے، اس خط کے نقوش سیمیائی پر تم دھوکا کھا رہی ہو، یہ کیسی بات ہے کہ شمع شعلہ افروز نہ ہو اور پروانہ جلکر راکھ ہو جائے، حسن سرگرم تجلی نہ ہو اور وادی ایمن بقعۂ نور ہو جائے، حسن یار جلوہ ریز نہ ہو اور کلیم غش کھا کر گر پڑے۔ خورشید نے جھنجلا کر کہا خدا کے لئے مجھے آخر وقت ملامت نہ کرو، آنے والے واقعات مجھ پر مخفی نہیں رہے ہیں اور ایک دردبھری آواز نے خواب کی ان تفصیلات کا تذکرہ کر دیا جن کو وہ دیکھ چکی تھی، شاما نے جب دیکھا کہ کسی طرح وہ اسکے خیالات میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی، تو نہایت منت سے کہنے لگی کہ پیاری خورشید معاف کرنا، میں نے غلطی کی لیکن میں اسقدر التجا کرتی ہوں کہ تھوڑی دیر صبر کرو۔ میں خود جاتی ہوں۔

رات کے بارہ بجے ہیں، اندھیری رات ہے، اور وحشتناک سناٹا چھایا ہے، سہیل کمرہ میں پلنگ پر لیٹا ہوا جگر پاش آہیں بھر رہا ہے۔

اُسکی صحت مایوس کن ہو گئی ہے، ضعف بے انتہا بڑھ گیا ہے اور اُسکے خوبصورت چہرہ پر زردی چھا گئی ہے، یکایک سہیل

کا دوست آکر اسکو اطلاع دیتا ہے کہ ایک خاتون جو اپنے کو خورشید جمال کے نام سے موسوم کرتی ہیں، تشریف لائی ہیں، اس سرور بخش آواز نے سہیل کے دل و دماغ میں شگفتگی پیدا کر دی، آنکھوں کی آغوش پھیل گئی اور نگاہ تشکر کے ساتھ بیتابانہ آگے بڑھی، شاما، جسنے خود کو خورشید جمال ظاہر کیا تھا، وہ پلنگ کے پاس آکر بیٹھ گئی اور کہنے لگی آپ کے خط کو پڑھنے سے میرے قلب میں ایک نشتر چبھ گیا، اور میں مضطربانہ حاضر ہو گئی ہوں کہیئے آپ کا مزاج کیسا ہے، "اُف آپ تو بیحد کمزور معلوم ہوتے ہیں۔

سہیل کی نظریں، خاتون کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں، سامعہ آواز دلکش سے ذوق نشاط لینا چاہتا تھا، لیکن یکا یک اُسکے انبساط و مسرت میں کمی محسوس ہونے لگی جو ابھی ابھی اُسکے حیات میں پیدا ہو گئی تھی، اُس کشمکش حیات کے ساتھ پھر خاتون کی طرف دیکھا، لیکن تخیل نے اُسکی دماغی البم میں جو فوٹو کھینچا تھا وہ اُس سے مختلف تھا اور جب اُس خاتون کے پیرایہ تقریر پر غور کیا تو اُسمیں اُن حسیات، اور جذبات کی آمیزش نہیں ملی جو اُسکے محسوسات میں تھی، اُس کا تخیل، اُس فریب نا طلسم میں محبوس نہو سکا اُسکی آنکھوں میں اشک حسرت بھر گئے، اُسکے سینہ سے ایک آہ نکلی اور کہنے لگا، خورشید! تم کہاں ہو آہ میرے لمحات واپسیں تشنہ دید رہے جاتے ہیں تاثرات اندوہ سے آواز کانپنے لگی، دل و دماغ پر تشنج جھٹکا پڑا، گردن جھکی اور غشی کی حالت طاری ہو گئی، شاما، اس نظارہ سے بدحواس ہو گئی اور اسکو یقین آگیا کہ سہیل کی زندگی کے یہ آخری لمحات ہیں، وہ وہاں سے فوراً روانہ ہو گئی، اور خورشید سے جاکر اس حسرت انگیز نظارہ کا ذکر کر دیا۔

شاما کے بیان نے بیقرار روح میں ایک مذبوحی تڑپ پیدا کر دی، اور دیوانہ وار شاما کو لیئے ہوئے خورشید اُس کمرہ میں پہونچ گئی جہاں کہ سہیل اب تک بحالت غشی پلنگ پر پڑا ہوا تھا، اب سہیل کے شامہ میں زلف عنبریں کی نکہت خیز یاں پہونچ جاتی ہیں، اور ایک نرم شیریں اور روح پرور صدا اُسکے کانوں میں پہونچتی ہی، کہ سہیل خدا کے لیئے آنکھیں کھولو، یہ قسمت خورشید آ گئی ہے، سہیل کی پلکیں اوپر اٹھتی ہیں، مردمک چشم کی تمنائے دید بیتابانہ آگے بڑھتی ہے، اور محبوب کے دلکش نظارہ سے سرور و شادمانی کا خمار حاصل کرتی ہے۔

تخیلی مرقع خورشید جمال کی تصدیق کرتا ہی، پیرایہ کلام مانوس ملتا ہی اور اس مختصر سے جملہ میں بھی حلاوت محسوس ہوتی ہی۔ عاشق و معشوق کی پرشوق نگاہیں باہم جذب ہونے لگتی ہے، اور ایک دوسرے کے جذبات صادقہ آپس میں سرگوشی کر لیتے ہیں۔

سہیل اظہار تشکر میں اُٹھنا چاہتا ہے، لیکن فرط ضعف سے مجبور ہو جاتا ہے، زبان کو جذبات مسرت کے اظہار میں حرکت دینا چاہتا ہے، لیکن وفور نقاہت مانع آتی ہے، اور وہ مجبوراً اپنی مسرت بیز نگاہوں سے تکمیل کرنا چاہتا ہے اور خورشید اُن سے واقف پاکر انتہائی درد و قلق میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

تھوڑی دیر میں سہیل کی سرد آہیں غیر معمولی تنفس میں تبدیل ہو جاتی ہیں، اُسکی پرشوق نگاہیں جلوۂ حسن محبوب میں

ڈوب جاتی ہیں اور حلقۂ چشم خالی رہ جاتا ہے، سر جو تکیہ پر رکھا تھا لٹک پڑتا ہے، اعصاب میں خفیف تشنج پیدا ہوتا ہے اور امیدوں وتمناؤں کے ہجوم میں اُسکی پرحسرت روح غائب ہوجاتی ہے۔

آہ! یہ جگر پاش نظارہ خورشید کے قلب و دماغ پر بجلی گرا دیتا ہے، جذبات بے قابو ہو جاتے ہیں، صبر و سکون فنا ہوجاتا ہے اور اُس شہید تمنا کی لاش پرحسرت کو دیکھکر اُس کے دل حزیں کے ٹکڑے کرتی ہوئی ایک دردانگیز چیخ نکلتی ہے اور صدمہ جانگزا اسے بیخود ہوکر اپنے محبوب کی لاش پر گر پڑتی ہے۔

لوگ دوڑتے ہوئے کمرہ میں داخل ہوتے ہیں اور دو مرمریں مجسمے دیکھتے ہیں جن پر حسرت وبیکسی برس رہی ہوتی ہے جنپر نامرادی اور ناکامی کے تاثرات پھیلے ہوئے ہیں، فرط حیرت میں وہ انگلیاں دانتوں میں داب کر رہجاتے ہیں۔

حزیں

غزل

مجھے، نہ عشق میں اتنا کر آسماں برباد
جو دیکھتا ہے وہ کہتا ہے "خانماں برباد"

کسی کے دل کو لگے یوں نہ عاشقی کی ہوا
نہ میری طرح بھی ہو کوئی نوجواں، برباد

کبھی عدم میں، کبھی اس جہان فانی میں
بتاؤں کیا، کہ رہا ہوں کہاں کہاں، برباد

الٰہی بخشدے اتنی بھی اب مجھے "طاقت"
کہ دل سے نکلے جو نالہ وہ "آسماں برباد"

نکل کے منہ سے مرے، ان پہ کچھ اثر نہ ہوا
فضا میں جاکے ہوئے نالہ و فغاں برباد

اسی کے دم سے ہے، تکلیف عاشقی کا وجود
بلا سے، ہجر میں ہو جائے میری جاں برباد

مریض عشق کے مرنے پہ لوگ سب کہتے ہیں
"ہوا ہے آج محبت کا اک جہاں برباد"

میں آہ بھی نہیں کرتا ہوں ہاتف اس ڈر سے
کہ ہو نہ جائے زمین اور آسماں برباد

ہاتف، بھوپالی

مولٹکے

جرمنی اس غیر معمولی لیاقت و قابلیت اور ذکاوت ذہانت والے شخص پر جتنا بھی فخر کرے بجا ہے۔ فی الحقیقت وہ جرمن قوم کا مایہ ناز و افتخار تھا، اسکی وفات نے وہ زبردست نقصان پہونچایا کہ جسکی تلافی نہ ہوسکی۔

تاریخ شاہد ہے کہ اسنے اوائل عمر ہی سے اپنے آپ کو فوجی زندگی کے لئے وقف کردیا تھا، اسکے تاریخی واقعات پڑھیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ جنگی کارناموں کی ایک مسلسل داستان ہے۔ آج کہیں سرفروشانہ جنگ میں مشغول ہے تو کل کہیں اپنی مستعدی و تندہی سے جرمنی کی عزت و وقعت قائم رکھنے کے لئے کوشاں ہے۔ کبھی جرمنی کی تجارت کو فروغ دینے کے لئے مختلف تدابیر سوچ رہا ہے تو کبھی دوسری مملکتوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لئے ذرائع پیدا کر رہا ہے کون ہے جو اس فدائے وطن کے تاریخی حالات پڑھ کر اپنے دل میں جذبہ حُبِ وطن محسوس نہ کرے؟ ایسے ہی چند لوگوں کے وجود نے اپنی ان تھک کوششوں حسن کارگزاریوں اور مساعی جمیلہ سے جرمن جیسی وحشی جنگی قوم کو مہذب اور دنیا کی ایک زبردست سلطنت بنا دیا اُسکے حالات زندگی پر عمیق نظر ڈالئے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا مطمح نظر جرمن کی فوجی حالت کی اصلاح کرنا، انہیں قومیت کا احساس پیدا کرنا، اور نئے آئین و قوانین کا مرتب کرنا تھا۔

ماہرین جنگ اس امر پر متفق ہیں کہ موجودہ فوجی آئین نقل و حرکت کے نظام کا موجد بھی مولٹکی ہے، جرمنی کی اصلاح تمدن اس کا بڑا حصہ ہے، اسکی مستعدی اور ذمہ دارانہ خدمات کیوجہ سے ریلوں کا جال اس سرے سے اس سرے تک پھیل گیا اور اولیت کا سہرا اسیکے سر رہا۔

عموماً دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص صرف ایک فن میں ماہر ہوتا ہے اور اپنی تمام زندگی اُسی فن کی تکمیل میں صرف کر دیتا ہے مگر اس کلیہ کے خلاف مولٹکی نہ صرف فوجی قابلیت سے

متصف تھا، بلکہ علم ادب و تاریخ میں بھی اعلیٰ دستگاہ اور سیاسیات میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔

اس کا نام مستحکم طور پر تاریخ جرمنی کے ان زریں عہدوں سے وابستہ ہے جب کہ جرمن قوم متمدن و مہذب ہونے کے لئے سرگرم کار اور کوشاں تھی، جرمنی افواج کی فوجی لیاقت و جنگجوئیت جو کہ جرمن کی مخصوص صفت ہے اس کا احساس پیدا کرنے میں مولٹکی نے بہت کوشش کی، ہر فوجی سپاہی اسکی ماتحتی میں کام کرنا باعث افتخار سمجھتا تھا، اور اسکے حسن اخلاق نے ان سب کو گرویدہ بنا لیا تھا، اس واسطے جرمنی فوج میں اُسے اس درجہ ہر دل عزیزی حاصل تھی کہ سپاہی اسے "باپ مولٹکی" کہتے تھے۔

کونٹ وان مولٹکی، پرشین فیلڈ مارشل جو ۳۰ سال تک پرشین افواج کا افسر اعلیٰ رہا، آخری نصف انیسویں صدی کا سب سے بڑا فنون جنگ کا ماہر تھا، ایک معمولی سپاہی کے مانند اسکی زندگی کا آغاز ہوا لیکن آخر میں جرمنی افواج کا فیلڈ مارشل ہو کر مرا۔ یہ نامور سردار بمقام پارشن سنہ ۱۸۰۰ء میں ایک شریف اور جنگجو خاندان میں پیدا ہوا سنہ ۱۸۰۵ء میں اسکے باپ نے ترک وطن کرکے ہولسٹین میں سکونت اختیار کی، مگر بدقسمتی سے اسی سال نقصان عظیم اٹھانا پڑا۔ یعنی اس کا گاؤں والا مکان آتشزدگی کی نذر ہوا، اور شہر وائے کو (جو شہر لیونک میں واقع تھا اور جہاں اسکے بیوی بچے مقیم تھے) فرانسیسی فوجوں نے پامال کر ڈالا، غرض مولٹکی نے ان ناموافق حالات میں پرورش پائی جب کہ اس کا باپ ان مصائب و آفات میں مبتلا تھا، اور زندگی کے دن عسرت و غربت میں کاٹ رہا تھا۔ ۱۱ سال کی عمر میں مولٹکی ڈانش فوج میں شریک ہو کر فوجی تعلیم حاصل کرنے کے لئے کوپن ہاگن بھیجدیا گیا۔ ابھی آغاز شباب تھا کہ اسکی فوجی قابلیت دیکھکر بادشاہ ڈنمارک نے اسے اپنا خاص بردار بنا لیا، کچھ عرصہ بعد ڈانش پیدل فوج کے عہدہ سکنڈ لفٹننٹی پر مامور کر دیا گیا۔ جب فوجی امور میں کچھ تجربہ حاصل ہو چکا تو ۲۱ سال کی عمر میں اپنے تمام حقوق سے دست بردار ہو کر جو اسے بحیثیت ایک سینیر ملازم کو حاصل تھے اسنے پرشیا کی ملازمت کا تہیہ کیا، فوجی مدرسہ میں شریک ہو کر بڑی محبت و جانفشانی سے فوجی

تعلیم کی طرف متوجہ ہوا اور عزت و امتیاز کے ساتھ فوجی امتحانات میں کامیابی حاصل کی، امتحانات سے فراغت حاصل کرنے کے بعد آٹھویں پیدل فوج جو فرانکفورٹ اودن آرڈر میں متعین تھی اسکے عہدہ سکنڈ لفٹنٹ پر اس کا تقرر کیا گیا۔ تئیس ۲۳ سال کی عمر میں اُسے جنگی مدرسہ عام" یا بیت الحرب میں شریک ہوکر تعلیم پانیکی اجازت ملی تین سال تک سلسلہ تعلیم جاری رکھنے کے بعد ۱۸۲۶ء فائنل امتحان میں شاندار کامیابی کے ساتھ پاس کیا، پھر ایک سال تک فرانکفورٹ اودن آرڈر کے کیڈٹ سکول کی صدارت کا کام انجام دیا، اور تین سال تک سیلیسا اور پوگن میں پیمائش کا کام کرتا رہا ۱۸۳۲ء میں افسران بالا نے خوش ہوکر برلن کے جنرل اسٹاف میں اس کا تبادلہ کردیا، اپنی حسن کارگزاری سے ایک ہی سال کے اندر فرسٹ لفٹنٹ ہوگیا، اپنے ستودہ اخلاق، حسن لیاقت، فوجی قابلیت، اور مستعدی کی وجہ سے تمام عہدداران بالا کی نظروں میں اسکی وقعت بڑھ گئی اور وہ اسے ایک لایق اور کارگزار افسر خیال کرنے لگے، خصوصاً شہزادہ ولیم جو اُس زمانہ میں لفٹنٹ جنرل تھا اور بعد میں شہنشاہ ہوا۔ اور اس کی عزت کرنے لگا پایہ تخت کی تمام مہذب و شائستہ سائٹیوں میں جابجا اس کا تذکرہ ہونے لگا، اور ہر سوسائٹی میں اس کا شاندار استقبال کیا گیا، اور لوگ اسکی دوستی کو باعث افتخار سمجھنے لگے اب وہ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگا۔

وہ نہ صرف فوجی کاموں کے لئے پیدا کیا گیا تھا بلکہ مبداء فیاض نے اسے ذوق سلیم اور ادبی مذاق بھی عطا کیا تھا جب اسے فوجی مشاغل سے فرصت ملی تو اسنے ادب اور تاریخ کی طرف اپنی تمام توجہ مبذول کی، اور ۱۸۲۷ء میں اسکی دماغی کاوش کا نتیجہ ایک مختصر فسانہ" دو دوست" شائع ہوا، اور ۱۸۳۱ء میں ایک طویل مضمون" فلپ دوم کے عہد میں جدا ہوکر ولیم اول کے قبضہ میں آنے تک کے ہالینڈ و بلجیم کے نسبتی تعلقات" کے عنوان سے شائع کیا جس سے بخوبی اسکے تبحر علم، وسعت معلومات تاریخ دانی اور سیاسی معلومات سے گہری دل دلچسپی کا ثبوت ملتا ہے، اور اس مضمون نے تمام لوگوں کو حیرت میں ڈالدیا کہ ایک فوجی ملازم جسے اپنے فوجی معاملات اور اداے فرائض سے بھی فرصت نہیں

سیاسیات میں کس درجہ عبور رکھتا ہے - ساتھ ہی ساتھ وہ بڑا سیاح بھی تھا اسکی دلی خواہش یہ تھی
کہ دور دراز ممالک کا سفر کرکے مختلف مقامات کے متعلق معلومات حاصل کرے، وقت و فرصت نکال کر
اسنے اپنی دلی تمنا کو پورا کرنے کے لئے جنوبی جرمنی اور شمالی اٹلی کا سفر کیا، ۱۸۳۵ء میں جب ترقی کرکے
کپتان ہوگیا تو اسنے جنوبی مشرقی حصہ یورپ کی سیاحت کے لئے چھ ماہ کی رخصت حاصل کی قسطنطنیہ
میں وہ کچھ عرصہ ٹھیرا نہ ہوگا کہ اسے سلطان محمود کی توجہ اپنی طرف منعطف کرانے کا موقع ملا اور سلطان نے
اس سے خوش ہوکر سلطنت ترکی کی ملازمت کرنے کے لئے کہا برلن سے باضابطہ اجازت حاصل کرکے
اسنے بخوشی عساکر عثمانی میں فوجی عہدہ قبول کیا قسطنطنیہ میں اس کا قیام دو سال تک رہا اسی
مدت میں ترکی زبان سیکھ لی سلطان کے حکم مطابق شہر قسطنطنیہ، باسفورس اور درہ دانیال
کے فوجی نقشے تیار کرنے کے لئے مذکورہ بالا مقامات کا سفر کیا، اور کامل جستجو سے مفصل معلومات
بھی فراہم کی، اور سلطان کے جلو میں بلغیریا، رومانیہ اور آبنائے کے شہروں کا سفر کیا، اور
۱۸۳۸ء میں ترکی جنرل افواج افریقہ کا مشیر بناکر مصر بھیجدیا گیا، وہاں محمد علی والیٔ مصر اور اسکے
متبنی فرزند ابراہیم پاشا کے ترکی ملک پر حملہ کیا (اس حملہ) میں ترکوں کو شکست فاش نصیب ہوئی
اور فوج تتر بتر ہوگئی - مولٹکی بمشکل بحر اسود تک پہنچنے میں کامیاب ہوا اور وہاں سے سیدھا قسطنطنیہ
گیا لیکن وہاں جانے پر اُسے معلوم ہوا کہ اسکے مربی سلطان محمود کا انتقال ہوچکا ہے، اسواسطے وہاں
ٹھہرنا مناسب نہ سمجھ کر برلن روانہ ہوا، اور دسمبر ۱۸۳۹ء کو بیماری کی حالت میں برلن پہونچا جب وہ
برلن سے رخصت ہوا تھا اُس وقت ایک درباری کی مردم شناس نظر ایک سپاہی کی سی پھرتی و چالاکی
اور ایک عالم کا تبحر علم رکھتا تھا، لیکن اب مختلف اقوام سے سابقہ پڑنے کی بنا پر اس کا دماغ نادر و
اور عجوبہ روزگار اور قیمتی تجربوں سے مملو ہوگیا جس سے اسکو آئندہ جنگی کارگزاریوں میں بیحد مدد ملی، اور ان
مشاہدات و تجربات کی وجہ سے اوروں کی بہ نسبت زیادہ کامیابی سے اپنے کام کو انجام دے پاتا۔
۱۸۴۲ء میں اسنے ایک دوشیزہ سولہ سالہ نازنین سے شادی کرلی، اور اب وہ چوتھی فوجی کور

متعینہ برلن کا افسر مقرر کر دیا گیا، اسنے ترکی و افریقہ کے چشم دید واقعات اور تجربوں کی رپورٹ شائع کی اور قسطنطنیہ، باسفورس اور درہ دانیال کے نقشے بھی طبع کرا کے شائع کئے اور مختلف رسائل میں مشرقی مسئلہ پر متعدد مضامین مختلف، اور نیز جغرافی حالات بھی لکھے۔

مولٹکی اب ترقی ریلوے کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے میں بے حد منہمک ہو گیا، ہیمبرگ برلن ریلوے کے اولیں ڈائرکٹروں میں سے ایک یہ بھی تھا، ۱۸۴۳ء میں ایک تنقیدی مضمون بہ عنوان "وہ فوری امور جو انتخاب طریق کو تعین کرتے ہیں" لکھا جس سے صنعت و حرفت کے پیچیدہ مسائل جو تعمیر ریلوے سے متعلق تھے انکے بارہ میں اسکی ہمہ دانی کا اظہار ہوتا ہے۔

۱۸۴۵ء میں شہزادہ ہنری کا ایجٹن مقرر کیا گیا جو اس وقت روما میں مقیم تھا۔ ۱۸۴۶ء شہزادہ کا انتقال ہو گیا، لہذا وہ کابلنز کی آٹھویں فوجی کور کے اسٹاف میں شامل کر لیا گیا، ۱۸۴۸ء میں کچھ عرصہ تک برلن کے "گریٹ جنرل اسٹاف" کا ممبر رہنے کے بعد میاگری برک کی چوتھی فوجی کور کا افسر اعلیٰ بنگیا، اور ترقی کرکے ۱۸۵۰ء میں لفٹنٹ کرنل اور ۱۸۵۱ء میں کرنل ہو گیا۔ ۱۸۵۵ء میں وہ شہزادہ فریڈرک ولیم جو بعد میں ولیعہد اور شہنشاہ ہوا اس کا ایجٹن اول ہوا۔ رجمنٹ متعینہ برسلا شہزادہ ولیم کے زیر کمان تھی اسلئے مولٹکی بھی بحیثیت ایجٹن کے ایک سال کمیں رہا اور ۱۸۵۶ء میں میجر جنرل کا عہدہ حاصل کیا، اور ۲۳ اکتوبر ۱۸۵۷ء میں فریڈرک ولیم چہارم کی سخت علالت کیوجہ سے شہزادہ ولیم نائب السلطنت مقرر کیا گیا ، ، ، ، ،، نائب السلطنت جو مولٹکی کی لیاقت و قابلیت کا مداح تھا اسنے پرشین افواج کے گریٹ جنرل اسٹاف کے عہدہ اعلیٰ کے لئے جو اس وقت خالی تھا مولٹکی کو منتخب کیا، اور جنوری ۱۸۵۸ء میں اس عہدہ پر مستقلانہ تقرر کر دیا گیا۔

وان رون اور بسمارک کی فوجی تنظیم و ترتیب کے عالیشان تجاویز میں ان کے ساتھ ملکر کام کیا، اور ہر طرح سے ان تجاویز کو کامیاب بنانے میں کوشش کی جسکا بہت بڑا اثر جرمنی کی انتظامی حالت پر پڑنیوالا تھا بہر حال ترقی کرتے کرتے ایک معمولی سپاہی سے گریٹ جنرل اسٹاف کے عہدہ اعلیٰ تک پہونچا، لیکن اسکے جنگی کارناموں کا یہیں خاتمہ نہیں ہوا بلکہ بسمارک کے ساتھ ملکر اسی تندہی اور مستعدی کے ساتھ کام کرتا رہا۔ ۱۸۵۹ء میں لفٹنٹ جنرل کا سا ذمہ دارانہ عہدہ دیا گیا، جنگ آسٹریا اٹلی میں جسمیں جرمنی کو اپنے مفاد کے لئے شریک ہونا پڑا تھا۔ مولٹکی نے کارہائے نمایاں کئے۔ اس کا تعلق اس زمانہ میں آسٹریا کے صدر مقام

رہا، اور جب خاطر خواہ شرائط پر صلح ہوگئی تو مولٹکی کی مدبرانہ کارروائیوں پر لوگوں نے اظہار تحسین کیا، اس جنگ کے بعد اسنے نہایت توجہ کے ساتھ پرشین جنرل اسٹاف اور پرشین فوج کے متعلق تمام ضروری اور اہم باتوں سے واقفیت حاصل کرنے میں مصروف رہا، آخرکار تمام فوجی امور اور جنگی اصول میں مہارت تمام حاصل کی۔ جب ۱۸۶۴ء میں ڈنمارک سے جنگ شروع ہوئی تو مولٹکی نے جنگی کارروائیوں کے نقشے اور حملہ کے متعلق تجویزیں پیش کیں اور انکو عملی جامہ پہنانے میں بڑی سرگرمی سے کام لیا، اور ۱۸۶۶ء کی جنگ میں بھی اسی مستعدی کے ساتھ کام کیا۔ بوہیمیا کے حملہ کی تمام تجویزیں اسی لفٹننٹ جنرل کی دماغ سوزی کا نتیجہ تھیں، کونگراٹز کی لڑائی جو اسکی تحریک سے شروع ہوئی تھی بذات خود شریک ہو کر داد شجاعت دی، اور دلیرانہ و بہادرانہ پرشین فوج کو دستوں کو بڑہاتے ہوئے آسٹریا اور ویانا کے خلاف چڑہائی کی، ساتھ ہی مہلت جنگ میں عہد و پیماں اور صلح کا سلسلہ جاری رکھا، ان خدمات کے صلہ میں اسے "بلاک ایگل" عطا کیا گیا، اور قوم کی طرف سے ۳۰ ہزار پونڈ کا گرانبہا نذرانہ دیا گیا جس سے سلیشیا میں کاریسا کا زرخیز خطہ خرید لیا اور آرام و آسائش کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگا

۲۴ دسمبر ۱۸۶۸ء کو اسکی بیوی نے برلن میں انتقال کیا اور اسکی راکھ کریسا میں دفن کی گئی، جہاں مولٹکی نے بیوی کی یادگار میں ایک شاندار مقبرہ تعمیر کرایا۔ ۱۸۷۰ء یکبیک فرانکو جرمن جنگ شروع ہوگئی اس جنگ میں اسکی پیش بینی ہشیاری اور کامیاب سپہ سالاری کی وجہ سے جرمن فوج کو بہت شہرت اور ناموری حاصل ہوئی جسکا عملی سپہ سالار یہی تھا، اس جنگ کا نقشہ اور تجاویز وغیرہ سب اسی نے مرتب کی تھے ۱۸۷۱ء کو میں، کونٹ کا معزز خطاب عطا ہوا، اسکی لاثانی خدمات کے صلہ میں فیلڈ مارشل کے عہدہ سے سرفراز کیا گیا اور دوبارہ قوم کی طرف سے نذرانہ پیش کیا گیا۔

اس جنگ کے اختتام پر اسکی زیر اہتمام جنگ کی [illegible] کی تاریخ [illegible] میں شائع ہوئی ۱۸۸۸ء میں فوجی زندگی سے دست بردار ہو گیا یعنی اس عہدۂ اعلیٰ سے مستعفی ہوا اور "قومی محافظ کمیشن" کی صدارت قبول کرلی،

پیرس کے ایک اخبار "ریوڈس دی دلوس" کے اڈیٹر کو دنیا کے مشہور زندہ بوڑھے لوگوں سے اس سوال کا جواب حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا کہ کن کتابوں نے ان کے دل پر سب سے زیادہ اثر ڈالا جنرل وان مولٹکی نے انتقال کے چند دن ہی بعد حسب ذیل الفاظ میں جواب دیا:-

"جناب من! مجھے آپ کے استفسار کا جواب دیتے ہوئے نہایت خوشی محسوس ہوتی ہے۔ میں آپکی خاطر ان کتابوں کی ایک فہرست بھیجتا ہوں جن سے مستفید ہونے کا موقع ملا، اور جنہوں نے میری زندگی کی تعمیر میں بڑا حصہ لیا ہے"۔

آپ کا مخلص
مولٹکی

کتابوں کی فہرست یہ ہے .... لڑو کی عجائبات جنت۔ لیبک کی کتاب خطوط متعلقہ زراعتی کیمیا، کلاسٹوز کی کتاب معلومات جنگ۔ اور اسکل۔ گوتھے۔ شیکسپیر۔ والٹر سکاٹ۔ رانک ٹریٹس۔ اور کارلائل کی تاریخی تصنیفات"

اس کے مذہبی خیالات جہاں تک تحقیق و تدقیق کے ساتھ معلوم ہوئے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ وہ ایک دیندار آدمی تھا۔ خصوصاً وہ "فرض" اور "سچائی" کا متبع تھا، اسے روزانہ انجیل (جس کا ایک قدیم نسخہ اس کے یہاں تھا اور جسکے صفحات پر انگوٹھوں کے نشان بتاتے ہیں کہ وہ کثرت سے انکا مطالعہ کیا کرتا تھا) کا مطالعہ کرنے کی عادت تھی، اسّی سال کی سالگرہ کی شام کو جو خط لکھا تھا اس کا اقتباس ناظرین کی تفنن طبع کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔

میں اپنی زندگی کے آخری سرے پر کھڑا ہوا ہوں، دوسری دنیا میں بالکل جداگانہ طور پر بازپرس ہوگی اور ہمارے اعمال کے مطابق ہمیں ان کا بدلہ ملیگا، ہماری شاندار کامیابیاں کچھ کام نہ آئیں گی، بلکہ ہمارے اعمال کی صفائی نیک نیتی، خلوص، وفاداری اور استقلال ہماری زندگی کا تصفیہ کریں گے۔

جب ہم دنیا پر ایک تنقیدی نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایک عجیب منظر "غربت و امارت" کے تفاوت کا نظر آتا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ ہمارے وجود سے بنی نوع انسان کو کیا فائدہ پہونچا، یہ بہتر ہے کہ ہم اپنے متعلق بڑے بڑے خیالات کو جگہ نہ دیں اور معاملات کی ظاہری شان سے انکی عزت کریں"۔

ایک کتاب میں مسیح علیہ السلام کے متعلق اپنے خیالات یوں ظاہر کئے ہیں "انھوں نے نوبت

زندگی بسر کی، خدمت گذار خاندان میں پیدا ہوے اور انہیں نے کوئی خاص جگہہ اپنے خیالات کی اشاعت کے لئے حاصل نہ تھی انہوں نے ماہی گیر کے ساتھہ نرمی اور ملائمت کے ساتھہ گفتگو کی نہوں نے بیماروں کو شفا بخشی، اور آخرکار سولی پر جان دی، تاہم اس دنیاے فانی میں کوئی چیز اسقدر پاک عالی خیال اور دنیاوی نقطہ نظر سے اسقدر کامیاب نہ تھی جتنا مسیح کا چال چلن، انکی تعلیم و موت تھی۔

اکیانوے برس کی عمر طولانی پاکر، دنیا کے مختلف انقلاب دیکھکر، اچانک، خاموشی اور بغیر کسی قسم کی بیماری کے ۲۴ راپریل ۱۸۹۱ء میں اس دار فانی سے کوچ کیا، بڑے تزک احتشام کے ساتھہ اس کا جنازہ اُٹھایا، اور بعد میں اُسکی لاش کر لیتیا کے مقبرہ میں بیوی کے بازو میں دفن کر دی گئی۔

ماہر فنون جنگ کی حیثیت سے اسے فریڈرک اور نپولین سے نسبت نہیں دی جا سکتی، اس واسطے کہ اسکو بادشاہی یا کمانڈری کے مانند کسی قسم کا اقتدار حاصل نہ تھا، لہذا یہ بات طے نہیں پائی ہے کہ آیا اس سے کوئی جنگی فروگزاشت سرزد ہوئی یا نہیں، یہ بات بالکل عیاں ہے کہ اسکو دماغ پر بغیر کسی قسم کا بار ڈالے الجھن و خوبی معاملہ کو سلجھانے کا خاص مادہ عطا ہوا تھا۔ ۱۸۶۶ء اور ۱۸۷۰ء کی جنگ سے ثابت ہوتا ہے کہ اسنے بغیر کسی دقت کے اپنے فیصلے صادر کئے اور اسے نتیجہ اخذ کرنے میں کبھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

وہ ایک دراز قد خوبصورت جوان تھا، جوں جوں عمر بڑھتی گئی وہ سنجیدہ ہوتا گیا اور اسکی چہرہ پر ایک قسم کی متانت نظر آنے لگی، وہ عادتاً تنہائی پسند اور کم سخن تھا۔

اسے ابتدائی زندگی کے حالات نے نہایت ضابط اور متحمل مزاج بنا دیا تھا، کبھی اسنے کسی کے ساتھ سختی و تشدد کا برتاؤ نہیں کیا، اس سے پہلے کہ پبلک روشناس ہوتی فوج اور فوجی اسٹاف میں وہ بہت مشہور ہو چکا تھا۔ اسکے ستودہ اخلاق کا ہر شخص گرویدہ تھا۔ اور اُس کا کوئی دشمن نہ تھا۔

(ملخص) سعیدی۔ بی اے۔ (علیگ)

پامپیا کا دور آخریں

سلسلہ گذشتہ

باب چہارم

دعوت کے دوسرے دن آئیونی سے ملاقات کرنے کے بعد گلاؤکس خیالات میں مستغرق اپنے کمرے میں ٹہل رہا ہے" میں نے اسے پھر دیکھ لیا ہے، صرف دیکھا ہی نہیں بلکہ دوبارہ اس سے باتیں بھی کی ہیں۔ اسکے گانے کا بھی لطف اُٹھایا ہے، وُہ یونان کی گزشتہ عظمت کے راگ گاتی تھی، میں نے اپنے خواب کی تعبیر کو پالیا ہے۔ . . . اس محویت سے اسے ایک سایہ نے چونکا دیا جو نیم کشادہ دروازہ سے دھوپ کی آئی ہوئی شعاعوں پر پڑا۔ اس نے پھر کر دیکھا۔ تو ندیا کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ ایک کم سن لڑکی کا سا تھا مگر اس کے نقش و نگار اسکی عمر سے بڑی عورت کے سے تھے۔ غم نے اسکے چہرہ پر مسکراہٹ نہیں رہنے دی تھی مگر اسکے ہونٹوں پر پیار کی شیرینی تھی۔ اگرچہ اسکی آنکھیں نور بینائی سے محروم تھیں مگر شفاف اور چمکدار تھیں اور بظاہر ان میں کوئی عیب نظر نہیں آتا تھا اسکے ایک ہاتھ میں پھولوں کی ٹوکری اور دوسرے میں پانی کا لوٹا تھا، اُس نے نوکروں سے پوچھا، کیا گلاؤکس یہاں ہے۔ میں اندر آجاؤں"۔

گلاؤکس۔ (بڑی نرمی اور شفقت سے) وہ کون ایسا سنگدل ہے جو تم پر ترس نہ کھائے۔

ندیا نے اس جملے کا جواب ایک ٹھنڈی آہ سے دیا۔ اور پوچھا "آپ پامپیائی میں تھوڑے ہی دنوں سے تشریف لائے ہیں۔

گلاؤکس۔ ہاں مجھے آئے کوئی چھہ دن ہوئے ہیں۔

ندیا۔ "آپ اچھے تو ہیں۔ آہ! میں یہ کیوں پوچھوں۔ بھلا وہ لوگ جو دنیا کو جو ایسی خوبصورت بتائی جاتی ہے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں کیوں خوش و خرم نہ ہونگے۔

گلاوکس - ہاں میں اچھا ہوں - اور تو ندیا، اور تو تو بہت بڑی ہوگئی ہے -

ندیا - میں کچھ دنوں بیمار رہی ہوں لیکن اب اچھی ہوں، میں آپ کے لئے کچھ پھول لائی ہوں، یہ ہیں تو معمولی مگر تازہ بنے ہوئے ہیں

گلاوکس - یہ بہت پیارے ہیں، میں پھر اپنے وعدے کی تجدید کرتا ہوں کہ اگر تو میرے لئے ایسے ایسے پھول لایا کرے گی تو میں اور کسی کے ہاتھ کے ہار نہیں پہنا کرونگا -

ندیا - آپ کے باغیچہ کے پھول کیسے ہیں، آپ ان کو شاداب پاتے ہیں یا نہیں ؟

گلاوکس - نہایت شاداب - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا میری عدم موجودگی میں خود دیوتا۔ اگر انہیں پانی دیتے رہے ہیں -

ندیا - آپ کے ان الفاظ سے میرا دل خوش ہوا ہے - کیونکہ جب کبھی مجھے فرصت ملتی تھی میں اگر انہیں پانی دے جاتی تھی -

گلاوکس - ندیا میں تیرا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں، مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ میرے پیارے پودوں کی میری غیر حاضری میں کوئی دیکھ بھال کر رہا ہوگا -

ندیا - اس جملہ سے کسی قدر گھبرائی اور اسنے گھبراہٹ کے چھپانے کے لئے منہ پھیر لیا -

بچارے پھولوں کے لئے آج سخت گرمی ہے، اس وقت انہیں میری ضرورت ہوگی - گزشتہ ۹ دن سے میں اس قدر کمزور تھی کہ ان کی دیکھ بھال نہیں کر سکی" اسنے سلام کیا اور باغ میں جاکر پھولوں کو پانی دینے لگی - گلاوکس ندیا کو جاتے دیکھ کر زیر لب گویا ہوا - "بچاری ندیا تیری تقدیر ہا! نہ تو دنیا کو دیکھ سکتی ہے، نہ سورج کو، نہ سمندر کو - نہ تاروں کو تیری بڑی بدقسمتی تو یہ ہے کہ تو آئیونی کو بھی نہیں دیکھ سکتی -

اس نام پر اسکے خیالات نے پھر گزشتہ واقعات کی طرف پرواز کی - لیکن اب کے کلوڈیس کے آنے سے اس کے خیالات منقطع ہوگئے گلاوکس کو آئیونی سے ایک ہی ملاقات میں اسقدر محبت ہوگئی تھی کہ اب اسکو کلوڈیس کا آئیونی کا تذکرہ کرنا بھی گوارا نہ تھا - حالانکہ پیشتر اسکے اسنے کلوڈیس سے اپنی سابقہ ملاقات کا ذکر خود بخود کر دیا تھا، اس کے خیال میں اس کا دوست

اس قابل نہیں تھا کہ آئیونی کا ذکر اس سے کیا جائے۔ لہذا جب کلوڈیس نے آئیونی کے حسن کی تعریف شروع کی تو گلاوکس کو برا معلوم ہوتا تھا، کہ ایسے ہونٹ اس کا نام لینے کی گستاخی کریں وہ سرد مہری سے جواب دیتا رہا۔ جس سے کلوڈیس یہ سمجھا کہ آئیونی سے اسکی محبت ٹھنڈی پڑ گئی۔ کلوڈیس اس خیال سے خوش تھا کیونکہ وہ تو یہ چاہتا تھا کہ گلاوکس کسی امیر زادی مثلاً ڈائیومڈ سوداگر کی لڑکی سے شادی کرے تاکہ کلوڈیس کو جوے میں ان کا روپیہ جیتنے کا موقع ملے چونکہ گفتگو چنداں دلچسپ نہ تھی اسلیئے کلوڈیس جلدی رخصت ہوگیا۔

کلوڈیس کے جاتے ہی گلاوکس نے کوئے یار کی راہ لی۔ باہر نکلنے پر اسے ندیا ملی جو اپنے کام سے فارغ ہوآئی تھی۔ اس نے پاؤں کی چاپ سے گلاوکس کو پہچان لیا۔ اور کہنے لگی "آج تو آپ سویرے ہی باہر تشریف لے جارہے ہیں۔

گلاوکس۔ ہاں صاحب آسمان اور کھلے موسم کا پیار اسماں دامن کشاں ہے۔

ندیا۔ اے کاش کہ میں بھی اسے دیکھ سکتی۔

مگر اسنے یہ جملہ کچھ ایسی دبی آواز میں کہا کہ گلاوکس اس حسرت آمیز شکوۂ قسمت کو نہ سن سکا ندیا تھوڑی دیر رکی اور پھر اپنی لاٹھی کے سہارے اپنے گھر کی طرف چل دی، شہر کے امیرانہ حصہ کو طے کر کے وہ غریبانہ حصہ کی طرف مڑی، چونکہ ابھی بہت سویرا تھا گلیاں سنسان تھیں ندیا تمام بازاری لوگوں کی غیر مہذب آواز سننے کے صدمہ سے محفوظ رہی۔ ندیا نے ایک افلاس زدہ مکان کے دروازے پر جاکر دستک دی۔ اس مکان میں برنو نام ایک بڈھا پہلوان رہتا تھا۔ دروازہ کھلنے پر کسی نے کرخت لہجے میں اس سے پوچھا کہ "کیا کچھ کما کر لائی ہے"۔ پیشتر اس کے کہ ندیا کوئی جواب دے ایک آواز آئی جو پہلی آواز سے ذرا کم کرخت تھی۔ برنو اسکی کمائی کی کم و بیش کو چھوڑ دو۔ اربی سس کے جلسۂ عشرت میں اسکے گانے کی پھر فرمائش آئی ہے اور تم جانتے ہو کہ وہ اچھے گانے والوں کو خوب معاوضہ دیتا ہے۔

— او! نہ! نہ خدا نہ کرے۔ میں صبح سے شام تک بھیک مانگوں گی مگر خدارا مجھے

اس کے ہاں نہ بھیجو۔

وہی "آواز" کیوں، وجہ، سبب ؟

"ندیا۔" اس لئے کہ...... میں جوان ہوں، اور شریف الاصل ہوں اور وہاں جو لوگ اکٹھے ہوتے ہیں وہ اس قابل نہیں ہوتے کہ مجھ سے مُنہ ملائیں جو..... بربو قہقہہ لگا کر" جو بربو کے ہاں کی لونڈی ہے...... آہا۔ آہا۔

لڑکی نے پھولوں کی ٹوکری نیچے رکھی اور منہ پر ہاتھ رکھ کر بے اختیار رونے لگی۔

ادھر گلاوکس آیوُنی کے ہاں پہنچا، اسنے دیکھا کہ اس کے گرد اسکے خدام کھڑے ہیں، اسکی ستار ایک طرف پڑی ہے۔ آیوُنی غیر معمولی خاموش سی کھڑی سوچ رہی ہے۔ دن کی صاف روشنی اور سادے لباس میں آیوُنی گزشتہ رات کی جگمگانے والی روشنی اور جواہرات سے مرصع پوشاک کی نسبت زیادہ حسین تھی، ان کی گفتگو یوناں کے متعلق تھی اور یہ مضمون تھا جسکا سُننا آیوُنی کو مرغوب خاطر تھا، جس پر گلاوکس کا ذخیرۂ فصاحت و بلاغت بے پایاں تھا۔

اسنے یونان کے باوقار پہاڑوں، سرسبز وادیوں، بل کھاتی ہوئی ندیوں کے کناروں پر کے زیتونوں کے جھنڈوں۔ عالیشان محراب ٹوٹتے ہوئے مندروں کا ذکر کیا۔ اس نے یونان کے عہد زریں کی شاعری اور دیگر فنون لطیفہ کا فسانہ دھرایا۔ آیوُنی ایک عالم خود فراموشی میں ہمہ تن گوش تھی۔

اپنے ہم وطن کو چاہنا کیا گناہ تھا، اس سے محبت کرنا یونان سے محبت کرنا تھا، اس کے ہونٹوں سے وہ اپنے معبودوں اور اپنے آباؤ اجداد کی آواز سن رہی تھی۔

اس دن سے دو دہر روز ملنے لگے۔ شام کے ٹھنڈے وقت میں وہ سمندر کے ساکن سطح پر کشتی کی سیر کرتے تھے، رات آیوُنی کے محل میں گرم صحبت ہوتے تھے۔ ان کا عشق فوری مگر مستحکم تھا۔ اور قدرتی امر تھا کہ ان کو آپس میں محبت ہو، دونوں کے شباب کے دن دونوں حسن صورت و حسن سیرت کے زیور سے مزین۔ ہم نسل۔ ہم مزاج۔ ان کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا آسمان ان کے عشق پر خوشیاں کر رہا ہے۔

پمپائی کی ملاقات کے چند دن بعد گلاوکس اور آئیونی چند احباب کے ہمراہ شام کے وقت کشتی پر سیر کر رہے تھے، دیگر احباب چہل پہل کر رہے تھے مگر گلاوکس خاموش۔ آئیونی کے قدموں میں بیٹھا تھا آئیونی نے مہر خاموشی کو توڑا "مجھے اپنے غریب بھائی کا خیال آتا ہے۔ کبھی وہ دن تھے کہ ایسی تفریح سے وہ بے حد مسرور تھا۔

گلاوکس - تمہارا بھائی ؟ میں نے اسے نہیں دیکھا ہے کئی دفعہ میں نے تم سے یہ دریافت کرنے کا ارادہ کیا ہے کہ آیا وہ تمہارا بھائی ہی تھا جس نے نیلپر کے ہیکل سے نکلتے ہوئے زینہ پر تمہارا ہاتھ تھام لیا تھا۔

آئیونی - ہاں ! وہ ہی میرا بھائی تھا۔

گلاوکس - کیا وہ پمپائی میں نہیں ہے۔

آئیونی - ہاں وہ یہیں ہے -

گلاوکس - میں پمپائی میں ہو کر وہ تمہارے پاس نہیں رہتا - ناممکن -

آئیونی - (افسوس سے) اُسکے فرائض اور ہیں - وہ آئی سس کا پجاری ہے -

گلاوکس - وہ تو بہت کم عمر ہے - اور آئی سس کی پابندیاں بہت سخت ہیں - اسنے یہ راہ کیوں اختیار کی -

آئیونی - وہ شروع ہی سے دلدادۂ مذہب تھا - اور ہمارا دوست اور سرپرست جو ایک قبطی ہے اس نے اسکو اس معبود کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے کی تلقین کی -

گلاوکس - مجھے امید ہے کہ وہ اس ایثار پر پشیمان نہیں ہوگا -

آئیونی نے ایک گہری سانس لی اور آنسوؤں کو چھپانے کے لئے نقاب کو نیچے کر لیا تھوڑے سے وقفے کے بعد اسنے کہا - کاش کہ وہ اس قدر عجلت نہ کرتا -

شاید ان لوگوں کی طرح جو بڑی بڑی امیدیں وابستہ رکھتے ہیں وہ بھی مایوس ہوا ہے -

گلاؤکس - تو وہ اپنی موجودہ حالت زندگی میں خوش نہیں ہے؟ یہ قبطی کون ہے، کیا وہ خود بھی پجاری ہے؟ اسے پجاریوں کے گروہ میں اضافہ کرنے میں کوئی دلچسپی ہوگی - ؟

آئیونی - یہ بات تو نہیں - اسے صرف بہبودی مد نظر ہے - اسکو خیال تھا کہ میرے بھائی کی دلی خوشیوں کے حاصل ہونے کا یہی ایک ذریعہ ہے - ہم یتیم ہیں -

گلاوکس - (باعنی لہجہ میں) میری طرح -

آئیونی نے نیچی نگاہ کرلی - "آربی سس ہمارے باپ کی جگہ ہے - آپ کو اس سے تعارف پیدا کرنا چاہیئے -

گلاوکس - آربی سس - میں اُسے جانتا ہوں - کم ازکم جب ہم ملتے ہیں تو صاحب سلامت ہو جاتی ہے" اگر تم اسکی اسقدر مداح نہ ہوتیں تو میں اس سے ملاقات بڑھانا نہیں چاہتا میری دوستی کا حلقہ بہت وسیع ہے - لیکن وہ کالا قبطی - اسکی چڑھی ہوئی تیوری - اس کا تلخ تبسم مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سورج میں بھی سردی پیدا کردے گا -

آئیونی - لیکن اسپر بھی وہ مہربان عقلمند اور نرم دل ہے - اسکی خاموشی اور سرد مہری گزشتہ مصائب کا نتیجہ ہیں - اس پہاڑ (ویسو ویس) کی طرف اشارہ کرکے) کی طرح جو سیاہ اور خاموش نظر آتا ہے - اس میں بھی کبھی آگ کے شعلے تھے جو اب ہمیشہ کے لئے ٹھنڈے ہو گئے ہیں -

جب اُسنے یہ کہا تو دونوں نے پہاڑ کو دیکھنا شروع کیا - صاف اور گلابی روشنی میں آسمان بہت بھلا معلوم ہوتا تھا - لیکن اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک سیاہ اور ڈراؤنا بادل سا تھا جو گویا اس خوبصورت منظر کے چہرے پر ایک بدنما داغ تھا -

اس منظر سے ان کے دلوں پر ایک قسم کا خوف طاری ہو گیا - اور ایسے ہمدردانہ جذبات میں جو محبت نے ان میں پیدا کردیے تھے اور جس سے ذرا سے خطرے کی جانب میں

دو محبت کرنے والے دل بچاؤ کے لیئے ایک دوسرے کی طرف کھنچتے ہیں۔ ان کی آنکھیں آپسمیں ملیں، کیا اس بات کے اظہار کے لیئے ان کو الفاظ کی ضرورت تھی، کہ ایک کو دوسرے سے محبت ہے۔

باب پنجم

ہم نے آربی سس کو آئی سس کے مندر میں کلینس کے ساتھ یہ مشورہ کرتے چھوڑا تھا کہ کس طرح وہ ایپی سی ڈس یہ جواب کم ہو رہا تھا پھر بڑھائے، قبطی کی متکبرانہ اور حکومت پسند طبیعت یہ کب گوارا کر سکتی تھی کہ وہ شخص جو کبھی اس کا غلامانہ تابعدار یوں اسکے ہاتھوں سے نکل جائے اسنے مصمم ارادہ کر لیا کہ جسطرح ہو اس سرکش جوان پجاری کو قابو میں لائے۔

وہ ان ہی خیال میں محو آئیونی کے گھر کی طرف جا رہا تھا، کہ راستے میں اسے ایپی سیڈس ایک درخت کے سہارے حیران کھڑا ملا، اسنے بڑھکر مشفقانہ ہاتھ ایپی سی ڈس کے کندھے پر رکھ کر کہا "بیٹا! کیا ہوا ہے۔ تم کیوں ہمیشہ مجھسے آنکھ چراتے ہو"؟ پجاری چونکا، اس کا پہلا خیال یہ تھا کہ بھاگ جائے، مگر پھر کچھ سوچ کر رکا، وہ خاموش اور مغموم تھا، اسکی نظریں نیچی اور ہونٹ تھرا رہے تھے، گھبراہٹ یا جوش سے اسکا دل دھڑک رہا تھا۔

قبطی: "اے میرے عزیز تم چپ کیوں ہو، تمہارے دل پر کوئی بوجھ ہے، تم اپنے دل کا راز مجھ سے بیان کرو"

ایپی سی ڈس: "تم سے؟ ہرگز نہیں"

"کیوں مجھسے یہ اخفا کیوں؟"

"کیونکہ تم میرے دشمن ہو"

"آؤ تھوڑی دیر باتیں کریں" قبطی نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔ اور پجاری کی بغل میں ہاتھ دیکر وہ اسے ایک پاس کی پتھر پر لے بیٹھا، دونوں آدمی ایسے پریشان تھے، جیسے ان کے اردگرد کے درختوں کا سایہ ایپی سی ڈس باوجود جوانی بوڑھا معلوم ہوتا تھا، اسکی کمر جھک گئی تھی، اس کا چہرہ پچکا ہوا اور زرد تھا، اسکی آنکھیں دبی ہوئی اور اسکے نازک ہاتھوں کی نیلی رگیں کمزوری سے ابھری ہوئی تھیں۔

قبطی نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا "تم کہتے ہو کہ میں تمہارا دشمن ہوں، مجھے اس ناحق کی تہمت کی وجہ معلوم ہے۔ میں نے تمہیں آئی سس کے پجاریوں میں شامل کیا، تم کو ان کے فریبوں سے صدمہ ہوا ہے، اور تمہارا خیال ہے کہ اس فریب ہی میں میں بھی شامل ہوں۔ ......"

"آپ کو ان کے فریب معلوم تھے، آپنے مجھسے یہ کیوں پوشیدہ رکھا، جب آپ نے مجھے آئی سس کی خدمت کے لیئے زندگی وقف کرنے کی تلقین کی تو آپ نے کہا تھا کہ وہاں کے پجاری سب نیک لوگ ہیں جو حق کے متلاشی ہیں اعانت

وہ جاہلوں کا ایک گروہ ہے جو سوائے دھوکے اور فریب کے کچھ نہیں جانتے، آپ نے کہا تھا کہ انہوں نے معرفت حقیقی کے لیئے دنیا ترک کی ہے، لیکن آپ نے مجھے ایسے لوگوں میں شامل کیا ہے، جو گناہوں میں غرق ہیں، یہ سب کچھ بے ایمانی اور بدنیتی سے کیا گیا ہے، میں جوان تھا، میں مالدار تھا، دنیا اور دنیا کی راحتیں میرے سامنے تھیں، میں نے بلا دریغ ان کو لات ماری، مجھے یہ یقین تھا کہ میں معرفت حقیقی حاصل کر دنگا، اور دیوتاؤں کی رفاقت کیسی صد حیف۔ اب، اب۔ ۔ ۔ ۔ ۔

رنج و غصہ سے اسکی آواز بند ہوگئی اور وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر بے اختیار رونے لگا،

قبطی" اے میرے عزیز، اے میرے شاگرد، جو کچھ وعدے میں نے تم سے کئے تھے وہ سب تمہاری آزمائش کے لیئے تھے، ان دھوکے باز پجاریوں کا خیال نہ کرو۔ ان کی رفاقت ترک کر دو۔ آج سے میں تمہارا ہادی و مرشد ہوں، تم اگرچہ آج میری دوستی پر طعن کرتے ہو، لیکن ایک دن آئیگا، جب تم میرے مداح ہو گے۔"

نوجوان نے سر اٹھا کر تعجب کی نگاہ سے قبطی کی طرف دیکھا۔

آرپی سس نے ادہر ادہر دیکھا اور پھر بڑی ملائمت سے کہا "تمام دنیا کی معرفت مصر سے نکلی، روما، اور ایتھنز کی فراست مصر سے نکلی، تمہاری متمدن قوم اپنی عظمت کے لیئے مصر کی رہین منت ہے، مصر اپنی عظمت کے لیئے اپنے پجاریوں کا ممنون ہے، مصر کے قدیم مقدس راہب خدا رسیدہ لوگ تھے، انہوں نے اپنے مذہب کے اصول روحانیت پر مقرر کیئے، لیکن جاہل عوام الناس ان اعلیٰ اور حکمت بھرے اصولوں کو سمجھ نہیں سکتے تھے، اسلیئے ان کی خاطر ان اصولوں کو فسانے بنایا گیا، آئی سس خود ایک فسانہ ہے (چونکو نہیں) آئی سس ایک تمثیل ہے، جو حقیقت کی قائمقام ہے، آئی سس ہے کیا؟ صرف طبعیت۔ یعنی سب چیزوں کی اصل، اور یہ طبیعت وہ چیز ہے جسے صرف معدودے چند عاقل ہی سمجھ سکتے ہیں، اسلیئے یہ راہبان بنی نوع انسان کے خیر خواہ ہیں، یہ مانا کہ انہوں نے عوام کو فریب دیا، لیکن اگر وہ فریب کو کام میں نہ لاتے، تو عوام الناس کی خدمت کیسے بجا لاتے، نادانوں کو فائدہ پہونچانے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں فریب دیا جائے، وہ کسی ایسے مذہب پر ایمان نہیں لائینگے جسے وہ سمجھ نہ سکیں، لیکن کرامت کا وقار ان کے دلوں پر بیٹھ جاتا ہے، تمہاری توجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تم اصلیت کو سمجھنے لگے ہو"

اپی سی ڈس خاموش تھا، لیکن اسکی غور بھری نظریں بتا رہی ہیں کہ قبطی کی چرب زبانی اس پر اپنا اثر کر رہی ہے

قبطی نے گفتگو کو جاری رکھا، "اپی سی ڈس۔ تمہاری ذات میں مجھے ایک ایسا شاگرد نظر آیا جو میری تعلیم کا اہل تھا، تمہاری فراست، تمہارا اشوق مذہب، تمہارے عقیدہ کی صفائی، یہ تمام باتیں ایسی تھیں، جو ایسے کام کے لیئے اجزائے ضروری ہوتی ہیں، جسمیں شریفانہ جبین کی ضرورت ہو، اسلیئے میں نے تمہیں یہ زندگی اختیار کرنے میں جرأت دلائی، لیکن تم مجھ پر الزام لگاتے ہو

کہ میں نے تمہارے ہم مشربوں کے اصلی چال چلن سے تمہیں آگاہ نہ کیا، اگر میں ایسا کرتا تو میرا مطلب خوب ہو جاتا، تمہاری طبیعت ان سے فوراً متنفر ہو جاتی اور یوں آئی سس دیوی ایک ایسے شریف پجاری کی خدمت سے محروم رہتی، ایپی سی ڈس کے منہ سے بے اختیار آہ نکلی، لیکن قبطی نے گفتگو کو نہ روکا، "اسلیئے میں نے تمہیں آگاہ کیئے بغیر ہیکل میں داخل کر لیا، میں نے یہ تم پر چھوڑ دیا، کہ تم از خود یہ تمام فریب، اور چالاکیاں معلوم کرو۔ کوئی تعجب نہیں کہ اس علم سے تمہیں صدمہ ہوا ہے لیکن تم عہد و پیمان دے چکے ہو۔ اب تم ہٹ نہیں سکتے، اب آگے ہی بڑھو، میں تمہارا راہ نما ہونگا۔

"او خوفناک انسان، اب تم مجھے کیا سکھاؤ گے، کیا نئے فریب اور نئے دھوکے؟" ۔۔۔ "اب تم تزلزل ایمان کے تاریک غار میں ہو۔ میں تمہیں استقامتِ ایمان کی روشن گھاٹیوں پر پہونچا دونگا۔ تم نے جھوٹ کو تو دیکھ لیا ہے آؤ میں تمہیں اب حق اور راستی دکھاؤں، آج رات کو میرے پاس آنا، لاؤ اب مصافحی ہاتھ ملاؤ"

قبطی کے الفاظ سے موثر و مبہوت ہو کر ایپی سی ڈس نے ہاتھ بڑھایا، اور استاد و شاگرد جدا ہوئے، استاد تو آئیونی کے گھر کی طرف۔ اور شاگرد۔ استاد کے ارشاد پر غور و خوض کرنے کے لیئے چل دئے

آربی سس کئی دنوں سے آئیونی سے نہیں ملا تھا، اسلیئے اسے آئیونی اور گلاکس کے تعلقات کی جو اب عشق و محبت کی حد تک پہونچ گئے تھے، خبر نہ تھی، باغ میں داخل ہوتے ہوئے اسے گلاکس کے گانے کی آواز آئی، حسد سے اسکے تن بدن میں آگ لگ گئی، تھوڑا آگے بڑھ کر وہ بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا، اسکی نگاہ اسکے سامنے کے منظر پر گڑ گئی۔

باغ کے ایک سایہ دار گوشہ میں آئیونی اور گلاکس بیٹھے تھے، بربط جو ابھی گلاکس بجا رہا تھا، نیچے اسکے پاؤں پاس رکھی تھی، ان سے کچھ دور لونڈیاں کھڑی تھیں، ان کی نظروں سے اوجھل قبطی ٹھہر گیا، ان کی گفتگو کے الفاظ اس تک پہونچ رہے تھے۔ گلاکس عشق و محبت کے فسانے کہہ رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا کہ دل کی اصلی محبت کے سامنے شاعروں کی بیان کردہ محبت کسقدر بے حقیقت ہے، قبطی مارے غصہ کے تھرا گیا لیکن اپنی حالت کو قابو میں رکھ کر وہ آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھا اور آئیونی کی کرسی کے پیچھے جا کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا، اسکے قدموں کی چاپ سنکر دونوں نے مڑ کر اسکی طرف دیکھا۔ گلاکس جگہ سے اٹھا اور ایک بناوٹی تبسم سے قبطی کو سلام کر کے بولا۔

"آپ کی تشریف آوری غیر متوقع ہے"

قبطی ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا، اور گلاکس کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"جنکو اپنی آؤ بھگت کا یقین ہو ان کو بن بلائے یوں ہی اچانک آنا چاہیئے"

آئیونی: "آپ دونوں صاحبوں کو آج اکٹھا دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے، کیونکہ آپ ایک دوسرے کے اسقدر ہم مذاق ہیں"

کہ آپ کو آپس میں دوست ہونا چاہیئے"

قبطی "میری عمر میں سے کم از کم ۱۵ سال کم کر دینے چاہیئیں، تاکہ میں گلاکس کی ہمعصری کا دم بھر سکوں، مجھے دعوتوں، پھولوں کے ہار، اور قمار بازی سے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوتی، یہ جوانی کے لوازمات ہیں، جو انسان ہی کے مذاق اور انسان ہی کی طبیعت کے لیئے موزوں ہیں، میں ان خوشیوں سے محروم ہوں، یہ کہکر مکار قبطی نے ایک ٹھنڈی سانس لی، اور نظریں نیچی کر لیں، لیکن کن انکھیوں سے وہ آئیونی کے چہرہ کو دیکھ رہا تھا، کہ گلاوکس کے چال چلن کے متعلق اسکے یہ الفاظ آئیونی پر کیا اثر ڈالتے ہیں، لیکن آئیونی کے چہرے کے رنگ سے اسے کوئی تشفی نہ ہوئی۔

گلاوکس نے جواب دیا "اے عقلمند آربی سس۔ آپ ٹھیک فرماتے ہیں، ممکن ہو کہ ہم ایک دوسرے کی قدر کریں مگر ہم دوست تو کبھی بھی نہیں ہو سکتے، جب میں آپ کی عمر کو پہونچ جاونگا۔ تو شاید میں بھی یہ مصلحت سمجھوں کہ عیش منانے کے لیئے وہی طریقے اختیار کروں، جو آپ نے اختیار کر رکھے ہیں، اور شاید پھر میں بھی نوعمر لوگوں کی طرز تفریح پر نکتہ چینی کروں"

قبطی نے بڑی سرد مہری سے کہا "معاف کیجیئے گا۔ میں آپ کے ارشاد کو مطلق نہیں سمجھا"

اور پھر بڑی لاپرواہی سے اسکی طرف سے منہ پھر اکر آئیونی سے مخاطب ہوا۔

"میں چند بار حاضر ہوا ہوں لیکن بدقسمتی سے میں آپ کی ملاقات سے محروم رہا ہوں"

آئیونی۔ (کسی قدر گھبرا کر) کچھ دنوں سے سمندر کی ساکن سطح اسقدر دلکش رہی ہے، کہ میں گھر میں رہ نہ سکی، آئیونی کی گھبراہٹ وہ سمجھ تو گیا مگر اسکو ظاہر کیئے بغیر اسنے جواب دیا۔

"آپ جانتی ہیں کسی شاعر نے کہا ہے کہ مستورات کو گھر ہی میں رہنا چاہیئے"

گلاوکس "وہ کوئی تنگ خیال شاعر ہوگا، اور اسے صنف نازک سے عداوت ہوگی"

آربی سس "شاعر نے اپنے ملک کے رسم و رواج کے مطابق یہ شعر کہا ہے، اور اس کا ملک یونان تھا، جسپر آپ کو اسقدر گھمنڈ ہے"

گلاوکس "لیکن ہر زمانے ور سمے، اگر ہمارے بزرگ آئیونی کو دیکھ پاتے تو کچھ اور ہی قانون بناتے"

قبطی "(ناک بھوں چڑھا کر) کیا آپ نے روما میں یہ فن تقریر سیکھا ہے"

گلاوکس "ہاں۔ کم از کم مصر میں تو یہ فن کوئی نہیں سیکھ سکتا"

جب آئیونی نے دیکھا کہ اسطرح کے جلے کٹے فقرے آربی سس اور گلاوکس کے درمیان دوستی پیدا کرنے سے رہے،

تو اس نے گفتگو کا پہلو بدلنے کی کوشش کی۔" آربی سس کو اپنے بیکس شاگرد پر اسقدر سخت گیر نہیں ہونا چاہیئے، میں یتیم ہوں اور ماں کی محبت سے محروم، جو آزادانہ طرز زندگی میں نے اختیار کی ہے۔ اسکے لیئے میں ہی قابل ملامت ہوں، لیکن روما کی عورتوں کی روزانہ زندگی یہ کوئی زیادہ آزادانہ نہیں ہے، یونان کی مستورات کیوں زیادہ غلامانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کی جاتی ہیں کیا صرف مرد ہی آزاد ہیں مردوں کی یہ غلطی ہے کہ وہ عورت کی حسیات کو مرد سے کم سمجھتے ہیں۔

مردوں کی یہ ناعاقبت اندیشی ہے جو ایسے قوانین وضع کرتے ہیں جو ان کی بیویوں اور ان کی لڑکیوں کی ترقی کے مخالف ہیں، اتنا کہہ کر آئیونی رک گئی، وہ ڈری کہ شاید میں جوش میں اکر ضرورت سے زیادہ کہہ گئی ہوں۔ اور وہ دل میں خوش ہوئی جب گلاوکس نے تائید کہا۔ آئیونی خدا کرے ہمیشہ تمہارے یہی خیال رہیں، اور تمھارا صاف دل ہمیشہ تمھارا رہبر ہو۔

آربی سس خاموش تھا، کیونکہ وہ نہ تو گلاوکس سے ہی ہم آہنگ ہونا چاہتا تھا، نہ آئیونی کی مخالفت کرنی چاہتا تھا، تھوڑی دیر گفتگو کرنے کے بعد گلاوکس اٹھا اور رخصت ہوا۔

جب گلاوکس چلا گیا تو آربی سس نے اپنی کرسی آئیونی کے قریب کرلی، اور اپنے اس مخصوص شیریں لہجے میں باتیں کرنے لگا جو اس کے اصلی چال چلن کی آڑ تھا، " آئیونی یہ خیال دل سے نکال ڈالو کہ میں تمہاری آزادی کے مخالف ہوں، ہاں اتنا ضرور کرو کہ اس آزادی کا دور اندیشی سے استعمال کرو، اہل دانش اور صاحب مذاق شرفا کی جسقدر تعداد اکھٹی کر سکتی ہو، کرو۔ اپنی خوشنوائی سے ان کے دلوں پر قبضہ کرو۔ لیکن یہ یاد رہے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو تہمت تراشنے اور ایک جوان خوبصورت عورت کے چلن پر دھبہ لگانے کے لیئے ادہار کھائے رہتے ہیں"

آئیونی۔ (کانپتی ہوئی آواز میں) صاحب آپ کیا فرماتے ہیں، میں جانتی ہوں کہ آپ میرے مربی ہیں اور میرے بھلے کی کہتے ہیں، لیکن آپ صاف صاف کہہ ڈالیئے کہ آپ کا مدعا کیا ہے"

قبطی " تمھارا مربی . . . . . . ! خیر بحیثیت ایک مربی ہی کے میری سنو۔ اس شخص گلاوکس سے تمہاری شناسائی کب سے ہے، کیا وہ اکثر اوقات آتا جاتا رہتا ہے"

اور آربی سس نے اپنی نگاہ آئیونی کے چہرہ پر جما دی۔

گھبرا کر اور رک رک کر آئیونی نے کہا " وہ میرے باپ بلکہ خود میرا وطن ہے اور اسی خصوصیت سے اس کا تعارف مجھ سے ہوا، اسکو ہفتہ یا دو ہفتے ہوئے ہونگے، مگر اس جرح سے آپ کا مدعا کیا ہے ؟

آربی سس " میں معافی چاہتا ہوں، مجھے یہ خیال تھا کہ تمھاری اس سے دیرینہ ملاقات ہے، کیونکہ ابھی کل کا واقعہ ہے کہ گلاوکس ایک بھرے مجمع میں تمھاری عشق کا اعلان کر رہا تھا، وہ کہتا تھا کہ تمھاری محبت اس کے دل کے بہلنے کا ذریعہ ہے

اسکے پیٹھ پیچھے میں اسکی برائی کیوں کروں، اس نے تمہارے حسن کی بہت تعریف کی، لیکن وہ کون ہے جسے تمہاری خوبصورتی سے انکار ہوگا، لیکن جب اس کے ایک دوست شاید کلوڈلیس یا کسی اور نے اس سے پوچھا کہ کیا آئیونی سے اسلئے سعد محبت ہے کہ وہ اس سے نکاح کرلیگا، تو اس نے اسپر قہقہہ مارا۔

آئیونی "نا ممکن۔ آپ نے یہ قابل نفرین فقرہ کہاں سے سنا"

آربی سس "کیا تم چاہتی ہو کہ شہر بھر میں جو باتیں تمہارے متعلق مشہور ہیں، میں انکو دہراؤں، مجھے پہلے پہل خود اس کا یقین نہیں آیا تھا، لیکن جب کئی آدمیوں نے متواتر اس قصہ کو بیان کیا، تو مجھے ماننا ہی پڑا، اگرچہ اس سے مجھے بیحد صدمہ ہوا"

آئیونی کا چہرہ سنگ مرمر کی طرح سفید پڑ گیا۔

قبطی "مجھے بڑا صدمہ ہوا تمہارا نام اسطرح لوگوں کی زبانوں پر ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے، اور میں آج تمہیں متنبہ کرنے آیا تھا، جب میں نے گلاوکس کو یہاں دیکھا تو میں مارے رنج کے آپے سے باہر ہو گیا۔ اور مجھے افسوس ہے کہ تمہاری موجودگی میں میں نے اس سے ایسی تلخ گفتگو کی، کیا تم مجھے معاف کردوگی"

آئیونی نے اپنا ہاتھ اسکی طرف بڑھا دیا، لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔

آربی سس "اسکو اب بھول جاؤ، لیکن خدارا آئندہ کے لیئے احتیاط کرو، جھوٹی افواہ صرف چند لمحے کے لیئے تکلیف دہ ہوتی ہے اور گلاوکس کے دلخراش الفاظ کی تو تمہیں ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے، الفاظ تو ان کے صدمہ دیتے ہیں۔ جن سے کچھ لگاؤ ہو"

قبطی نے بڑی چالاکی کی کہ آئیونی کی افتادِ مزاج یعنی اسکی غیرت کو نشتر مارا، اس نے خیال کیا کہ گلاوکس اور آئیونی کی چند روزہ ملاقات محض ایک عارضی جذبہ ہے۔ پھر جھٹ گفتگو کا پہلو بدل کر اسکے بھائی کے متعلق باتیں شروع کردیں لیکن یہ باتیں زیادہ دیر تک نہ رہیں، اور وہ اٹھکر رخصت ہوا۔ اس نے ارادہ کرلیا کہ وہ آئندہ آئیونی کی حرکات کی خوب دیکھ بھال کریگا، اور روزانہ آیا کریگا، قبطی کے جانے کے بعد آئیونی زیادہ دیر اپنی طبیعت کو قابو میں نہ رکھ سکی، اس کا استقلال جاتا رہا، اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

برکت علی

کل اور آج

اقوام و ملل دنیا کے "دورۂ زندگانی" میں "صدیاں" دنوں بلکہ گھنٹوں کا حکم رکھتی ہیں، جب کہا جاتا ہے کہ "فلاں قوم فلاں صدی میں ایسی تھی اور ویسی تھی" تو یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ: فلاں شخص کل اس حال میں تھا، اور آج اسکی یہ حالت ہے، اور جس طرح کسی شخص کے اندر تغیر حال باعتبار صحت و بیماری ایسے اسباب پر منحصر ہوتا ہے، جو مدتوں پہلے سے اس کے جسم کے اندرونی تہ میں آہستہ آہستہ رفتہ رفتہ کام کرتے رہے تھے، بعینہ اسی طرح ایک ملت کے اوضاع و اطوار کا تبدل و تغیر بھی بحیثیت ترقی و تنزل انہیں اسباب پر مشتمل ہے جو صدیوں پہلے سے اس کے قلب و روح کی گہرائیوں میں رفتہ رفتہ کام کر کے نتائج قطعی وجود میں لاتے ہیں۔

جو علم انسان کے تغیر مزاج کے اسباب تلاش کرے، اور حفظ صحت کے ذرائع یاد دلائے اسے "علم طب" اور جس سے قوموں کے امراض اجتماعی کی علتیں معلوم ہوں، اور اس کے علاج کی تعلیم حاصل ہو اسے "فن تاریخ" کہتے ہیں۔ گویا فن تاریخ مقدرات ملل کی بہترین نمائش گاہ ہے، تاریخ حیات نوع بشر کا ایک سینمائے دائم الحرکت ہے، تاریخ زمین و زماں کی جام جہاں نما ہے، تاریخ ایک پردۂ نقاشی ہے جس پر روئے زمین کی قوموں کے طلوع و غروب کے آثار، ترقی و انحطاط کے نقوش، اور متضاد واقعات و حادثات عالم کی جیتی جاگتی رنگا رنگ تصویریں صاف و شفاف نظر آتی ہیں، تاریخ ایک ایسی خوشنما بساط ہے جسے عناصر اجتماعی کے ہزار ہا ہاتوں نے کردرہا نفوس بشر کے رشتۂ حیات سے قرن ہا قرن کی مدت میں بنا ہے۔

جن قوانین سے حوادثات عالم اور انقلابات سیاسی باہم مربوط ہوتے ہیں، اور جو اسباب و علل ان روابط کی تولید کرتے ہیں وہ بہترین طور پر صفحات تاریخ پر ہی نمایاں نظر آتے ہیں، اور بعد میں تدقیقات تاریخی کے ذریعہ روشن کیئے جا سکتے ہیں۔ تاریخ کی قلمرو میں بھی وہی ازلی قانون کام کر رہا ہے جو عظیم الشان کائنات اپنے زیر اثر کیئے ہوئے ہے اُس قانون سے یہ مراد ہے کہ کوئی اثر بے موثر اور کوئی حادثہ بدون کسی علت و سبب کے صفحہ طبیعت (فطرت) میں وجود پذیر نہیں ہوتا۔ چنانچہ اسی قانون کی بنا پر کسی قوم کی ترقی یا انحطاط کی وجہ موجبہ اُس کی تاریخ یعنی اسکی زندگی کے گزرے ہوئے دنوں میں تلاش کرنی چاہیئے، اسواسطے کہ اُس کے مقدرات امروزی اُسی کے "اعمال دیروزی" کے پیدا کیئے ہوئے ہیں۔ اور اسی طرح اس کے "اقدامات امروزی" اس کے "فردائے مقدرات" پیدا کریں گے، کیا ایسا نہ

ہے؟ - کیا کوئی اس حقیقت ثابتہ سے منکر ہو سکتا ہے! نہیں، کبھی نہیں، جو کچھ ہم نے کل کیا ہے اُسی کا ثمرہ آج حاصل کر رہے ہیں۔ یا جو حالات ہمیں آج پیش آ رہے ہیں وہ ہمارے اعمال دیروزی کا محصول ہیں۔

"کل" ہمارے ہاتھ سے نکل گیا، ہمارے دائرہ اقتدار سے خارج ہو گیا اب ہم اُسے کسی تدبیر سے نہیں پا سکتے، اور نتائج اعمال دیروز کے آگے بے بسانہ طور پر گردن جھکا دینے پر محض ناچار و مجبور ہیں، لیکن بخلاف ازیں "آج" ابھی ہمارے قبضہ میں ہے، ہم اس کے جائز مالک و مختار ہیں "آج" ہمارے ہاتھ میں بطور ایک آلۂ کار اور اوزار کے ہے ہم جیسا چاہیں اس سے کام لے سکتے ہیں۔ اور چونکہ "آج" سے "فردا" بالکل متصل ہے اسلیئے قانون طبیعی کی رو سے "آج" ہی سے بطور پیشگی ہمیں فردا پر بھی پورا اقتدار حاصل ہے، کیونکہ "فردا" کا ہمارے لیئے "بہترین" ہونا ہمارے آج کے حسن استعمال پر ہی موقوف و محتاج ہے۔ آج ہمارے لیئے ایک "فرصت غنیمت" اور قادر مطلق کی سب سے بڑی نعمت ہے، اور چونکہ وہ بھی عنقریب مبدل بہ دیروز ہو کر ہمارے قبضۂ مالکانہ سے پلک جھپکانے میں نکلنے والی ہے، اسلیئے سب سے پہلا استفادہ جو حیات دیروز سے ہمیں حاصل کرنا چاہیئے وہ "درس عبرت و نصیحت ہے" اگر ہم اپنی "آج" کی حالت سے کسی طرح مطمئن اور خوشنود نہیں ہیں، اگر ہم نہیں چاہتے کہ ہمارا فردا، امروز ہی کی طرح رہے تو ہم پر واجب بلکہ فرض ہو جاتا ہے کہ فرصت امروزی غنیمت سمجھیں اور دیروز کے خلاف کام شروع کر دیں، یعنی گزشتہ سے عبرت حاصل کریں، کیونکہ دیروز کے برعکس کام کرنے ہی کو "عملی عبرت" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، ہم پر فرض عین ہے، کہ اپنے قوائے عمل سے کام لے کر آج کی فرصت غنیمت عمدہ کاموں، اور نیز دیں، اعلیٰ ترین نتائج پیدا کرنے والے اعمال میں صرف کریں، تاکہ ہمارا تاریک مستقبل سورج کی طرح روشن ہو جائے، اور ہم قعر گمنامی و بدنامی اور ذلت و نکبت کے اندھیرے گڑھے سے نکل کر اپنے عمل کی صادق روشنی میں قوموں کو نظر آنے لگیں اور نعمت و سعادت و خوشحالی پر بتمامہ قابض ہو جائیں۔

(ترجمہ) ایڈیٹر

رباعیات عمر خیام کے لطائف و دقیق

اُردوئے لطیف میں

از مسٹر وہاج الدین حیدر بار ایٹ لاء سکرٹری ہوم ڈپارٹمنٹ بھوپال

مسٹر وہاج الدین حیدر، وہاج بھوپال کے ایک ممتاز رکن ہیں، موصوف کو شعر و سخن سے کچھ اسقدر دلچسپی ہے، کہ باوجود مصروفیت فرائض منصبی، آپ کچھ نہ کچھ مشغلہ ضرور جاری رکھتے ہیں، آپ کا کلام فن شعر کا ایک نادر نمونہ ہے، غزل، قصیدہ، نظم، رباعی، غرضکہ جو کچھ فرماتے ہیں، نہایت قادر الکلامی کے ساتھ، باایں ہمہ موصوف دنیائے شہرت سے بہت دور رہنا چاہتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ کسی رسالہ میں آپ کا کلام دیکھنے میں نہیں آتا۔
لیکن ناممکن تھا کہ "مخزن الملاک" جس سے آپ کو خاص خصوصیت ہے آپ کے افکار سے شرف یاب ہوتا ہم شکر گزار ہیں کہ ہماری استدعا پر چند متفرق غزلیں، اور کچھ رباعیات عمر خیام کے منظوم اُردو ترجمے عطا فرمائے گئے ہیں جو درج کیئے جاتے ہیں:-

ایڈیٹر

خیام

آمد سحری ندا ز میخانۂ ما — کای رند خراباتی دیوانۂ ما
برخیز کہ پر کنیم پیمانۂ ما — زاں پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما

ترجمہ

حسرت وصل نہ اسے بیخبری بہجائے — آکے آئینۂ دل میں نہ پری رہ جائے
کہیں ایسا نہ ہو بھر جائے مرا ساغر عمر — مے مرے حصہ کی شیشوں میں یا بھری رہ جائے

خیام

ایں کوزہ گراں کہ کوزہ ہا ساختہ اند — بشکستہ و بر رہگذر انداختہ اند

زنہار کہ پائے بر سفالش نہ نہی
کیں کوزہ ز کاسۂ سرے ساختہ اند

ترجمہ

اے مست ناز دیکھ نہ اتنا مچل کے چل
یہ ٹھیکرے نہ پاؤں کے نیچے کچل کے چل
مٹی میں مل کے کاسۂ سر یہ بنے ہیں جام
عبرت کی جا ہے میکدہ، ساقی سنبھل کے چل

خیام

آنکس کہ بہ دہر نیم نانے دارد
وز بہر نشست آستانے دارد
نے خادم کس بود نہ مخدوم کسے
گو شاد بزی کہ خوش جہانے دارد

ترجمہ

جسے دنیا میں روزی بے کد و کاوش میسر ہو
ضرورت کے موافق بیٹھنے اٹھنے کا اک گھر ہو
نہ خود نوکر کسی کا ہو نہ اُس کا کوئی نوکر ہو
مبارک زندگی ہے جسکی دنیا ایسی خوشتر ہو

خیام

گر بادہ خوری تو با خردمنداں خور
یا با صنمے سادہ رخ و خنداں خور
بسیار مخور، ورد مکن، فاش مساز
کم کم خور و گہہ گہہ بخور و پنہاں خور

ترجمہ

مے پی اہل شعور کی صحبت میں
تھوڑی تھوڑی، کبھی کبھی خلوت میں
پہلو میں ہو یار بے تکلف ہنس مکھ
جائز ہے جو میکشی تو اس صورت میں

خیام

بت گفت بہ بت پرست اے ساجد ما
دانی ز چہ روئے گشتی عابد ما
بر ما ز جمال خود تجلی کرد است
آنکس کہ ز تست ناظر و شاہد ما

ترجمہ

بت نے کہا اپنے پرستار سے
تو ہے بندھا کس لیئے زنار سے
نور اُسی کا ہے جسے سے ہے خبر
عاشق و معشوق کے اسرار سے

خیام

رباعیات عمر خیام

گر مے نہ خوری طعنہ مزن مستاں را — گر دست دہد توبہ کنم یزداں را
تو فخر بدیں کنی کہ من مے نخورم — صد کار کنی کہ مے غلام ست آں را

ترجمہ

شیخ جی رندوں پہ یہ طعنہ زنی اچھی نہیں — زہد و تقویٰ پر رعونت آپ کی اچھی نہیں
اپنے اعمال زبوں پر بھی ذرا کیجیے نظر — توبہ توبہ، اُن سے بھی کیا سنگدلی اچھی نہیں

ان تراجم کے علاوہ موصوف نے بہ استفادۂ تقلید عمر خیام، رباعیات و قطعات بھی تحریر کیے ہیں، جن کا نمونہ ملاحظہ طلب ہے:-

گل نے بلبل سے کہا ہنس کے کہ دیکھ اے ناداں — رنگ و بو پر مرے بیفائدہ ہو تو قرباں
تجھکو صیاد نے چھوڑا تو نہ چھوڑیگی قضا — مجھکو گلچیں نے نہ توڑا تو نہ چھوڑیگی خزاں

زندگی دی تھی تو جینے کا مزا بھی ملتا — فکر دنیا کی نہ ہوتی تو خدا بھی ملتا
فرصت و راحت و سامان نشاط و لب جو — چاندنی رات میں وہ ماہ لقا بھی ملتا

ناظرین "محسن الملک" کی دلچسپی کے لیے موصوف کی چند غزلیات کے اشعار بھی تحریر کیے جاتے ہیں:-

سحر کیا اُنکی نگاہ نرگس جادو میں ہے — دل نہیں پہلو میں لیکن درد دل پہلو میں ہے
بیخودی میں اسقدر حس بھی نہیں باقی رہی — دل تھا کس پہلو میں اور اب درد کس پہلو میں ہے
دل سے خالی دیکھکر پہلو جو وہ آتا ہے یاد — میں سمجھ لیتا ہوں وہ دل کی جگہ پہلو میں ہے
لیکے دل جاتے کہاں ہو آؤ بیٹھو اسطرف — دل کی اور دلبر کی دونوں کی جگہ پہلو میں ہے

کیجیے وا آج کس سے شرح حال بیدلی
خود سمجھ لیگا کسی کے دل اگر پہلو میں ہے

یہ چند اشعار بھی ایک غزل کے ہیں جو ملاحظہ طلب اور لائق داد ہیں۔

تماشے دیکھئے تشبیہ حسن و عشق کامل کے — کھلے ہیں گل کے دریا بہتے ہیں خونِ عنادل سے کے
شبِ وعدہ بھی حسرت مجھ سے روئی ہر گلی مل کے — مسہری پر جو کلیاں بقیں وہ سب مرجھا گئیں کھل کے
جواں ہو نکلی تو نکلیں گے کبھی تو حوصلے دل کے — یہ دانہ بھی کبھی پھوٹے پھلیگا خاک میں مل سے کے
بہار آئی ہی سبزہ پر زمرد زہر کھاتا ہے — لٹائے دیتے ہیں لعل و گہر کو پھول کھِل کھِل کے
چمن سارا بھبوکا ہو گیا ہے آتشِ گل سے — یہ انگارے بچھے ہیں یا گرے ہیں پھول کھِل کھِل کے
بہار آئی ہے ساقی جام مے دے بوسۂ لب دے — یہ ایسا کرتے ہیں غنچے چٹک کے پھول کھل کھل سے کے
یہ تارے ٹوٹتے ہیں یا فلک آنسو بہاتا ہے — پھپھولے پھوٹتے ہیں یا کسی ٹوٹے ہوئے دل کے
نہ ٹوٹا آنسوؤں کا تار جب تک دم نہیں ٹوٹا — مگر ٹوٹے نہ پیمانِ وفا ٹوٹے ہوئے دل کے

یہ شعر بہت پر لطف ہے :-

نکالا دل کو سینہ سے، مری جانِ حزیں نکلی — مگر اُن کے نکالے سے نہ نکلے حوصلے دل سے کے

وہاج

نیرنگیٔ حسن

از مولوی وحید الدین سلیم حیدر آبادی

اے حسن! خود نمائی کا جب تجھکو ہوش تھا — ایک ایک قطرہ میں ترے دریا کا جوش تھا
جب دلبری میں حسن ترا گرم جوش تھا — غمزوں کو چین تھا، نہ کرشموں کو ہوش تھا
گوشے میں خانقاہ کے افسردہ ہے وہ آج — کل تک جو شمعِ انجمنِ نا و نوش تھا
اُس کے غرورِ حسن نے توڑا غرورِ دیں — وہ خود فروش تھا، تو میں ایماں فروش تھا
تعظیم کو اٹھی مری ہر موج سلسبیل — میں سجدہ ریز سنگِ درِ مے فروش تھا
اے عشق سر بھلے کو ترے در پہ جھک گئے — عالم وگرنہ بتکدۂ عقل و ہوش تھا
پہونچا جو حکم ضبط تو دب دب کے رہ گیا — سینے میں گرچہ حشر کا پنہاں خروش تھا
حل کرنے جب لگا وہ معمائے عشق کو — چہرہ سے فلسفی کے اڑا رنگِ ہوش تھا

پرتو پڑا جو حسن کا چشم خیال پر — عالم تمام اک سبد گلفروش تھا
عالم نہ پوچھ اُس کا جو دل لے گیا مرا — کافر تھا، مست ناز تھا، گیسو بدوش تھا
صبح ازل کی پہلی کرن کا یہ تھا اثر — ہستی کا ذرہ ذرہ تبسم فروش تھا
آتی تھی روح برق کی کھنچکر مرے لیئے — میں عالم شباب میں وہ بادہ نوش تھا
دامن بچا کے چلتی تھیں مجھ سے قیامتیں — دل میں مرے کبھی وہ امنگوں کا جوش تھا
تاروں کو اُس کے تیرے اشاروں نے دی کمک — ورنہ یہ ساز ہستیِ انساں خموش تھا

فکر سخن جو کرنے لگا شام سے سلیم
تا صبح آج محوِ ندائے سروش تھا

سلیم

افکار ہادی

مرے ہر نفس میں چھپا ہوا مرے سوز غم کا شرار ہے — میں وہ مبتلائے فراق ہوں جسے صبر ہے نہ قرار ہے
تری یاد عہد کرم ہی پر مری زندگی کا مدار ہے — یہی جسم شوق کی جان ہے یہی باغ دل کی بہار ہے
تری بیرخی نے غضب کیا مری حسرتوں کو مٹا دیا — نہ وہ لطف نغمۂ بلبلاں نہ وہ کیف رنگ بہار ہے
غم جانستاں کی یہ کشمکش دلِ مبتلا کی یہ صورتیں — مری عمر یاس کا ہر نفس مرے حق میں دز شمار ہے
یہ غضب کہ تجھ سے جدا بھی ہو کے بقید ننگ حیات ہوں — یہ ستم کہ عمر فراق کا مری زندگی میں شمار ہے
وہ نظام عشق بدل گیا نہ وہ میں ہاں نہ وہ تو رہا — نہ وہ ناز ہے، نہ نیاز ہے، نہ وہ بادہ ہے نہ خمار ہے
جو ترے ستم کے ہیں حوصلے ہیں مٹی فنا کے بھی ولولے — ترے دل کو شوق ستمگری مرے سر کو حسرت دار ہے
کہوں کسطرح کہ نصیب تھیں کبھی وصل یار کی لذتیں — وہی شکل یاس ہے سامنے وہی رنگ لیل و نہار ہے

یہ مآل ہادی خستہ جاں کا ہوا کہ بعد فنا کہیں
نہ تو ذکر اُسکی وفا کا ہے نہ نشان سنگ مزار ہے

ہادی مچھلی شہری

دیوانگیٔ الفت

محبوبِ دل و جاں سے ہی، اے مری وحشت تو سرمایۂ عشرت تو، گنجینۂ راحت تو
دیوانۂ الفت سے رکھتی ہے محبت تو تنہائی کی مونس ہے، اور ہمدمِ غربت تو

تو وہ کہ ترے دم سے آباد ہیں ویرانے
پرجوش ہیں مستانے، پرشور ہیں میخانے

گو عشق کی دنیا میں ملتا ہے نشاں تیرا اقلیمِ محبت میں سکہ ہے رواں تیرا
لیکن نہیں ہو سکتا محدود مکاں تیرا جس سمت نظر ڈالو، جلوہ ہے عیاں تیرا

بت خانہ میں، مسجد میں، کعبہ میں کلیسا میں
گلزار میں دریا میں، کہسار میں، صحرا میں

کچھ میں ہی فقط تیرے جلوے کا نہیں مفتوں ہیں اور بھی دیوانے مشہور تہِ گردوں
تو بھول گئی ہو تو میں نام تجھے گن دوں منصور ہو یا سرمد، فرہاد ہو یا مجنوں

ان سب کے دماغوں پر تیری ہی حکومت ہے
ان سب کی زبانوں پر تیری ہی تو مدحت ہے

سودائیوں نے تیرے کیا کیا نہ لقب پائے مجذوب کہیں ٹھہرے پاگل کہیں کہلائے
دی جان بہت سوں نے سر دار پہ کھنچوائے لیکن تری الفت سے اک لحظہ نہ باز آئے

معلوم نہیں تجھ میں کیا شان نظر آئی
جس نے بھی تجھے دیکھا وہ ہوگیا شیدائی

کوئل کے جگر میں تو اک ہوک اٹھاتی ہے قمری کے کلیجہ میں تو آگ لگاتی ہے
رگ رگ سے عنادل کی تو خون بہاتی ہے یوں اپنے فسانہ کو رنگین بناتی ہے

پروانہ پہ کیا اچھا احسان کیا تو نے
اک حسن کے شعلہ پر قربان کیا تو نے

مذہب وہ ترا جسمیں خاموشی ہے گویائی — مسلک وہ ترا جسمیں نادانی ہے دانائی
عادت وہ تری جس کو مرغوب ہے تنہائی — فطرت وہ تری جسمیں آزادی و خودرائی

تو وہ ہے کہ غافل کو بیدار سمجھتی ہے
بیہوش جو ہو اُس کو ہشیار سمجھتی ہے

تو وہ کہ ہر اک مشکل تیرے لیئے آساں ہے — جو درد بھی پیدا ہو تیرے لیئے درماں ہے
ہر زخم جگر تیرا گویا گل خنداں ہے — ہر داغ ترے دل کا اک شمع شبستاں ہے

اسباب ہر راحت کا سامان ستم تجھکو
ایوانِ مسرت ہے زندانِ الم تجھکو

تو بزم حسیناں میں اک طرفہ تماشا ہے — ہے حسن ترا مفتوں تو حسن پہ شیدا ہے
تو مجمع طفلاں میں دلچسپ کھلونا ہے — القصہ تری ہستی ہر رنگ میں یکتا ہے

ذی ہوش ہیں جتنے سب کرتے ہیں ثنا تیری
بھاتی ہے دل و جان سے ہر ایک ادا تیری

سنسان بیاباں میں خاموش فضاؤں میں — بارانِ مسلسل میں تاریک گھٹاؤں میں
سورج کی تمازت میں اور گرم ہواؤں میں — سیلاب میں آندھی میں اور سخت بلاؤں میں

ہر حال میں ہر لحظہ سرگرم سفر ہے تو
دنیا کے حوادث سے بیخوف و خطر ہے تو

تو حسن پرستی میں ممتاز و نمایاں ہے — ہر شے تری نظروں میں رنگین ہے تاباں ہے
کانٹا بھی گل تر ہے صحرا بھی گلستاں ہے — ہر ذرۂ خاک تر خورشید درخشاں ہے

صحرائے جنوں تجھکو پر نور نظر آیا
ہر ایک جبل تجھکو اک طور نظر آیا

روشن ترے عنواں سے قانون شریعت ہے — رنگیں تری سرخی سے مضمونِ طریقت ہے
تو مظہرِ قدرت ہے آئینۂ وحدت ہے — تو جانِ نبوت ہے تو روحِ رسالت ہے

سینوں میں رسولوں کے ہے حسن نہاں تیرا
نبیوں کی زبانوں پر انداز بیاں تیرا

وہ دن بھی تھے جب تیرا سودا ہی نہ تھا سر میں — میں فرق سمجھتا تھا دیوار میں اور در میں
شیدائے خرد بنکر تھا قید سراسر میں — ادراک کی گردش میں احساس کے چکر میں

غم سارے زمانہ کا اور فکر قیامت کی
اس آئینہ خانہ میں تصویر تھا حیرت کی

غمگین میں رہتا تھا ناکامیٔ قسمت سے — اپنوں کی پریشانی غیروں کی مصیبت سے
واقف ہی نہ تھا مطلق دنیائے مسرت سے — گلزار محبت سے، میخانۂ الفت سے

ڈوبا ہوا رہتا تھا دریائے تصور میں
کھویا ہوا رہتا تھا صحرائے تحیر میں

میں سوچتا تھا، دنیا معمور الم کیوں ہے؟ — اور جنس مسرت اس بازار میں کم کیوں ہے؟
اوروں کے لیے عشرت، میرے لیے غم کیوں ہے؟ — یہ نظم جہاں کیسا؟ یہ جبر و ستم کیوں ہے؟

اس دام تفکر سے آزاد کیا تو نے
ناشاد تھا مدت سے ہاں شاد کیا تو نے

محمد شریف فکری

التجا

طبع کم نواز دے، ذوق فغاں طراز دے — یعنی دل فسردہ کو تاب نفس گداز دے
سرد ہیں سارے ولولے، آتش شوق پھونک دے — سوز دروں کو پھر مرے قوت شعلہ ساز دے
نقش عبودیت جو تھے، اب ہیں وہ کچھ مٹے مٹے — ذوق فتادگی بڑھا، بیخودی نیاز دے
رنگ بہار دہر کا نذر سموم ہو چکا — موج نسیم کر رواں، ذوق چمن طراز دے

درخور لطف گر نہیں رزمیؔ خستہ و حزیں
تیری نگاہ قہر ہی عزت امتیاز دے

"سعید رزمی"

۷۸۶

جلد ۲
شمارہ ۶

محسن الملک

قیمت سالانہ (صر)
ششماہی (رے)

مرتبہ

حامد بھوپالی

فہرست ماہ فروری سنہ ۲۵ء

نوابزادہ سعید الظفر خاں بہادر کی علمی سرپرستیاں

اور

"عالیجاہ اُردو لائبریری" کا افتتاح

اگر یہ صحیح ہو کہ دنیا میں کچھ ایسی ہستیاں بھی گذری ہیں اور گذرتی رہینگی جنکی زندگی کو ملک و قوم کی زندگی اور موت کو ملک و قوم کی موت سے تعبیر کیا جائے، تو بلا شبہ نواب محسن الملک فردوس مکان کی موت کو بھی اہل بھوپال کی علمی و ذہنی موت کے ہم معنی اور مرادف تسلیم کرنا پڑیگا۔

فما کان قیس ہلکہ، ہلک واحد
ولکنہ بنیان قوم تہدما

حقیقت یہ ہے کہ نواب محسن الملک کی ذات برگزیدہ صفات سے اہل بھوپال کی بڑی بڑی توقعات وابستہ تھیں لیکن بے درد و ظالم موت نے تمام توقعات کو تباہ کر دیا، اور بھوپال پر عرصہ دراز کے لئے یاس و قنوط کی افسردگی طاری ہو گئی، مگر قدرت، جو کبھی مخلوق کی ضروریات و مصائب سے غافل نہیں ہوتی، اس نقصان دہ سانحہ کے ظہور پذیر ہونے سے قبل ہی ایک ایسی ہستی کی تربیت میں مصروف تھی، جو صحیح طور پر اس نقصان کی تلافی کر سکے اور محسن الملک مرحوم کی جانشینی و قائمقامی کے فرائض کما حقہ انجام دے سکے، وہ ذات نواب زادہ سعید الظفر خاں بہادر بالقابہ کی ذات گرامی تھی، چنانچہ نواب محسن الملک مرحوم کی وفات کے بعد ہی اس روشن ضمیر و جواں بخت نواب زادہ کے جوہر عیاں ہونے لگے، اور دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ جو اخلاق و عادات فضائل و محاسن، نواب فردوس مکان کی زندگی کے لئے سرمایۂ عزت و وقار تھے وہی نواب زادہ محتشم کی حیرت انگیز دانشمندی اور قابلیت کا مظہر ہیں اور محسن الملک مرحوم کی اعلےٰ اور حکیمانہ تربیت کا ثبوت دے رہے ہیں۔

عالیجناب نواب زادہ سعید الظفر خاں صاحب بہادر نے سب سے پہلے جس معاملہ میں اپنی ذکاوت حس اور فرض شناسی کا ثبوت دیا وہ اس چار لاکھ روپیہ کے گرانقدر تعلیمی وقف کی بحالی کا معاملہ تھا، جسکی طرف سے پبلک کی اکثریت بہت سے تلخ تجربوں کی بنا پر مایوس ہو چکی تھی اور بظاہر عوام کے لئے کوئی اطمینان بخش صورت نظر

نہیں آتی تھی، لیکن نواب زادہ محتشم نے فوراً اس بےچینی کو رفع کر دیا، اور وقف شدہ رقم کی طرف سے تمام لوگوں کے خطرات کو زائل کر دیا

اسیطرح رسالہ محسن الملک کی سرپرستی اور فیاضانہ اعانت بھی آپ کی علم پروری اور بھوپالیوں کی حوصلہ افزائی کا کافی ثبوت ہے۔ یہ رسالہ میری اس عقیدت و دلی ارادت کی حقیر ترین یادگار ہے جو نواب محسن الملک کے کریمانہ اخلاق، غیر معمولی فیاضیوں اور پبلک ورکس کے باعث، میرے دل میں عرصہ سے راسخ ہو چکی تھیں، لیکن اسکی بقاءِ حیات کا بیشتر تعلق نواب زادہ عالی حشتم کی سرپرستی سے ہے، اور توقع ہے کہ یہ رسالہ نواب زادہ بہادر کی سرپرستی میں بہت جلد اپنے تئیں ملک و قوم کا ایک بہترین خدمت گزار ثابت کرنے میں کامیاب ہو سکے گا۔

ہر چند نواب زادہ محتشم کی چشم کرم اور فیاضی ہمارے اعتراف و منت گزاری سے قطعاً بے نیاز ہے لیکن میرے جذبات اس امر پر مجبور کر رہے ہیں کہ اسی سلسلہ میں اس اعانت کا بھی تذکرہ کروں جو آپ نے اکتوبر ۱۹۴۴ء سے ایک خاص رقم ماہانہ رسالہ کے لیے مستقل طور پر منظور فرما کر میری ناچیز کوششوں کو نوازا ہے، تاکہ رسالہ محسن الملک کے مخلص احباب کو بھی اس مسرت میں شریک ہونے کا موقعہ حاصل ہو سکے۔

لیکن ان سب سے زیادہ اہم اور قابل قدر عالیجاہ اردو لائبریری کے قیام کی تجویز ہے، جہاں تک مجھے معلوم ہے اردو کی کوئی ایسی مخصوص لائبریری نہیں جسمیں اردو کا قدیم لٹریچر اور تصانیف کا مکمل سرمایہ موجود ہو، البتہ ضمناً اردو کا مختلف اور تھوڑا بہت ذخیرہ ہندوستان کے متعدد کتب خانوں میں پایا جاتا ہے، لیکن یہ اس قابل نہیں کہ شیفتگان اردو کی اس سے تسکین ہو سکے یا اُسے کوئی خاص اہمیت دیجا سکے، فی الحقیقت یہ ایک بہت بڑی کمی تھی، جسے نواب زادہ سعید الظفر خاں صاحب کی علم پرور ذات نے اپنے عم عالی وقار، سرکرنل عالیجاہ نواب محمد نصر اللہ خاں بہادر کی یادگار میں، عالیجاہ، اردو لائبریری قائم کرکے پورا کر دیا، اور یہ اردو لائبریری جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، اردو کی سب سے پہلی لائبریری ہوگی، اور سرزمین بھوپال کے لئے اس لائبریری کی اولیت ہمیشہ قابل فخر سمجھی جائیگی۔

نواب زادہ محتشم اس لائبریری کے قیام کے تمام مراحل طے فرما چکے ہیں، صرف کتابوں کی ترتیب اور لائبریری کا قیام باقی ہے، جو عنقریب انجام پا جائیگا۔ اور مارچ ۱۹۴۵ء تک بتوفیق الٰہی اس مقدس یادگار کا شاندار افتتاح ہو سکے گا، ہمیں مسرت ہے کہ نواب زادہ موصوف نے اس لائبریری کی تہذیب و ترتیب کی ذمہ داری

اور اہتمام کا مشکل کام، ہمارے فاضل دوست مولوی سعید رزمی بھوپالی کے سپرد فرما کر اپنے انتخاب کا اعلیٰ ثبوت دیا ہے، مولوی سعید رزمی، ملک کی علمی جماعت کے ایک ہونہار فرد ہیں جو بہرصورت اس لائبریری کے لئے بہت کچھ مفید ثابت ہوں گے۔

مجھے توقع ہے کہ بھوپال کی علمی جماعت بھی اس لائبریری کے متعلق اپنے فرائض کو محسوس کریگی ہرچند نواب زادہ محتشم کی توجہ اور دلچسپی کے بعد کسی جماعت کی اعانت و توجہ کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی، لیکن پھر بھی امور عامہ میں جنکا تعلق عامہ خلائق سے ہوا کرتا ہے، کسی کام کو کوئی خاص فرد تنہا طور پر انجام نہیں دےسکتا، اور بڑی بڑی حکومتوں کو پبلک اعانت و دلچسپی کا متوقع ہونا پڑتا ہے۔ اسلئے اگر میں اہل بھوپال کو اسطرف توجہ دلاؤں تو بیجا نہ ہوگا۔

مجھے ہندوستان کی علمی جماعتوں اور محترم مصنفین سے بھی توقع ہے کہ وہ اپنی گراں قدر مطبوعات اور مصنفات سے لائبریری کی اعانت فرمائینگے، تاکہ عالی جاہ لائبریری بہت جلد اُردو زبان کی ایک مکمل لائبریری ہونے کا فخر حاصل کرسکے۔

اب آخر میں میں نواب زادہ سعید الظفر خاں بہادر یا لقابہ کی خدمت میں بھوپال کی تمام علمی جماعتوں کی طرف سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ نواب زادہ محتشم کی ذات گرامی بہت جلد نواب محسن الملک کی افسوسناک کمی کو پورا کردیگی اور اہل بھوپال کو آپ کی علمی دلچسپیوں سے بیش از بیش استفادہ کے مواقع حاصل ہوتے رہیں گے۔ انشاء اللہ تعالے۔

ایڈیٹر

سنہ فصلی کی تحقیقات

فصلی سنہ کو ہندوستان کے دفاتر مالگذاری میں رواج پائے ہوئے ۳۳۲ برس سے کچھ زیادہ دن ہوئے مگر لوگوں کو اس کا علم نہیں ہے کہ یہ سن کیوں اور کب ایجاد ہوا، اور اسوقت کون سنہ ہجری و کون سنہ عیسوی تھا، واضح ہو کہ آئین اکبری اور رسالہ قاضی نجم الدین خاں اور دیگر رسالہ ہائے تقاویم اور زائچوں کے کتب تواریخ سے بالاتفاق ثابت ہے کہ پہلے ہندی دفتروں عہد راجگان و مہاراجگان میں راجہ بکرماجیت فرمانروائے ملک مالوہ جس کی دارالسلطنت کا مستقر اُجین تھا سنہ پت جاری تھے، جو اب سمت لکھے جاتے ہیں اور اس سنبت کی بنیاد حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ۵۶ برس پہلے قائم ہوئی تھی، اور مہاجنی حساب کتاب میں راجہ جدھشٹر کے سن جو اسوقت سنہ ۱۹۲۴ء ہیں اسوقت وہ (۵۰۸۵) ہیں اور سال باہن کے ساکھے جو اسوقت ۱۸۵۲ ہیں لکھے جاتے تھے۔

اور راجہ جدھشٹر کے سنہ کی ابتدا حضرت مسیح علیہ السلام سے ۳۱۶۲ برس پہلے سے ہے، جس کا بہی کھاتوں اور ہنڈیوں میں اب تک رواج ہے۔

سنہ ۱۵۵۵ء اور سنہ ۹۶۳ ہجری میں جب حضرت ابو الفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاہ ہند انار اللہ برہانہ نے تخت سلطنت ہند پر جلوس فرمایا تو حمیت اسلامی اس بات کی مقتضی ہوئی کہ سنبت جو پہلے سے جاری ہے اسکو مسترد کر کے دوسرے سن کا رواج ہند کے دفتروں میں اور بخصوص مالگذاری کے حساب کتاب میں دیا جائے، چنانچہ بادشاہ موصوف کے دس برس کی فکر کے بعد سنہ ۱۵۶۴ء میں دیوان توڈرمل و مرزایان فارس کے صلاح و مشورہ سے جب غرہ محرم کا ابتدائی فصل خریف کے مطابق پڑا تو سن ہجری کے مطابق باعتبار شمسی مہینوں ہندی کے نیا سن فصلی ایجاد کیا، کیونکہ اس کا مدار فصل پر تھا اسلیئے نام بھی سنہ فصلی رکھا بعض کا مقولہ ہے کہ اس نئے سنہ ہجری سنہ سے ملایا گیا تھا اسلیئے نام اسی سنہ کا وصلی رکھا کثرت استعمال سے واو ف سے بدل گئی اور وصلی کا فصلی ہوگیا بات تو معقول ہے غرض کہ وہ وصلی ہو یا فصلی اسکو جو سن ہجری سے ملایا گیا تو اسبات کا خیال اسوقت نہ رہا کہ سن ہجری کی ابتدا ماہ محرم سے اور سنہ فصلی کی ابتدا اکتوار سے ہے سنہ فصلی و سنہ ہجری میں آگے چلکر بہت بڑا تفاوت پڑ جائیگا، پس ایسا ہی ہوا جسکی صراحت آگے چلکر ہوتی ہے

یہ تجویز قائمی سنہ فصلی کی ہو کر ہند کے کل دفتروں میں خصوصاً حساب کتاب اور مالگذاری کے دفاتر میں اسی سنہ فصلی کا رواج دیا گیا۔

جب کچھ عرصہ گذرا تو اصلی اور نقلی یا اصلی و فصلی سالوں میں تفاوت پیدا ہونے لگا چنانچہ اکبر بادشاہ کے بعد اسکے بیٹے سلیم نور الدین جہانگیر بادشاہ کے عہد کے وثیقوں میں سنہ ہجری و سنہ فصلی سنہ کے درمیان میں دو برس کا تفاوت پڑا، ہجری سنہ بڑھ گئے اور فصلی سنہ گھٹ گئے

علیٰ ہذا القیاس محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کے زمانہ میں چار برس کا تفاوت ہوا، اور محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں پانچ برس کا تفاوت ہوا، اسی طرح سے ۳۳ برس کے اندر سنہ ۹۷۱ ہجری سے کہ ابتدائی تاریخ ایجاد سنہ فصلی کی ہے نہایت سنہ ۱۲۸۶ ہجری نو برس کا فرق پڑا کیونکہ فصلی سنہ ۱۲۷۷ تھے جنہیں نو کا عدد ملانے سے پورے سنہ ۱۲۸۹ ہجری ہوتے ہیں۔ اسوقت سنہ ۱۹۲۴ء اور سنہ ۱۳۴۳ ہجری اور سنہ ۱۳۳۲ فصلی ہیں باہم ان دونوں کے دس برس کئی مہینہ اور کئی دن کا تفاوت ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سنتو برس پیچھے تین برس کچھ دنوں اوپر تفاوت ان دونوں سنوں کا قائم ہوتا ہے وجہ اسکی یہ ہے کہ ہجری سال قمری ہونے سے ۳۵۴ دن رات اور ۲۲ گھڑی یعنی ۸ گھنٹہ ۴۸ سکنڈ کا ہوتا ہے، اور فصلی سنہ شمسی ہونے سے ۳۶۵ دن رات کا ہوتا ہے اسلئے ہجری اور نقلی فصلی سنوں میں اتنی مدت کے بعد زمین آسمان کا بُعد ہو جاتا ہے، سنہ فصلی کے ایجاد کے وقت اس تفاوت کا کچھ بھی خیال نہ رہا، ایک بار عربی اور یونانی برسوں کی بابت خواب اصحاب کہف کے وقت تک کا سچا فیصلہ اسی طرح سے ہو چکا ہے،

اس صورت میں ثابت ہو کہ بیشک سنہ فصلی کا ماخذ سنہ ہجری ہے اور تفاوت ان دونوں میں بباعث قمری و شمسی کے ہو گیا ہے۔

جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ معظمہ سے .... مدینہ منورہ ... تشریف فرما ہوئے تو تاریخ ۴ ربیع الاول اور ۱۵ جون سنہ ۶۲۲ء تھی، سنہ ہجری کی ابتدا یکم محرم سے ہوئی تو دس مہینہ کے بعد سنہ ہجری شروع ہوا ہے۔

کہتے ہیں کہ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سترہ برس کے بعد سنہ ہجری کو ایجاد کیا ہے حضرت کی ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں جن جن صحابہ کی تولید و وفات واقع ہوئی ہیں انکی تاریخ مندرجہ کتب تواریخ شہادت دیتی ہیں کہ ہجرت کے دسویں مہینہ محرم سے سنہ ہجری کا آغاز ہے۔

محمد اسمٰعیل نقوی

نالۂ یاس

حسرت کا اک مرقع میں زار و ناتواں ہوں
پروردۂ الم ہوں خوکردۂ فغاں ہوں

ہمدم ہے تلخ کامی عہد کہن سے میری
تعمیر ہے خمیر یاس و محن سے میری

دامن کشاں ہے راحت مجھ درد آشنا سے
جلتی ہے شادمانی بچ کر مری ہوا سے

منت کش سماعت کب میری داستاں ہے
صورت سے میری میرا حال زبوں عیاں ہے

ناکامیوں سے دل میں ناسور پڑ گئے ہیں
نقش مراد بنکر کتنے بگڑ گئے ہیں

برسیں سی ہو گئی ہیں بے یار و خانماں ہوں
کہنے کو ہوں جہاں میں کیا جانے پر کہاں ہوں

جائے در اجابت ہے چرخ ہفتمیں پر
راز فتادگی ہے میری فغاں کا جوہر

اس شام درد و غم کی یا رب کہیں سحر ہو
کچھ بخت راہ پر ہو نالوں میں کچھ اثر ہو

یا پھر غم نہانی کچھ میری جان گھلائے
یا کاش موت ہی پر کچھ رحم مجھ پہ کھائے

آہیں نہ میری بڑھ کر عرش بریں ہلائیں
جان حزیں کو میری اپنا ہدف بنائیں

شعلے تپ الم کے بھڑکیں تمام تن میں
لگ جائے آگ میری ہستی کی انجمن میں

ناصر اٹاوی

تجلیات سہا

کچھ دگرگوں سا نظر آتا ہے ایمانوں کا رنگ
کیا اڑاتے ہو انہیں آنکھوں سے پیمانوں کا رنگ

یہ نگاہیں نیچی نیچی اور یہ باتیں بے محل
کوئی دیکھو تو ذرا ان مست پیمانوں کا رنگ

بدگمانی ہی عبث، دیدار ہم پر تہمتیں
صاف شکل آئینہ ہی ہم سے حیرانوں کا رنگ

کیسے وارفتہ ہوا خواہانِ جوشِ حسن ہیں
دید کے قابل ہی اس موسم کے دیوانوں کا رنگ

ہے غرورِ حسن ہی درپردہ عاشق کی طلب
کھل گیا اہلِ وفا پر شوخ نادانوں کا رنگ

ہم سے دیوانوں کو حسنِ بے تکلف چاہیے
چھیڑنے کو ہی سہی، چھوڑ دو بیگانوں کا رنگ

میری حالت سے نمایاں جلوہ انکے حسن کا
انکی صورت سے عیاں سب میرے ارمانوں کا رنگ

ہیں معاصی رازہائے عشق رحمت اے سہا
یاں تو آلودگی ہی پاک دامانوں کا رنگ

سہا

ہم نے یہ انتظام کیا ہی کہ آیندہ ماہ سے محسن الملک بالتصویر شائع ہو

بھوپال کی علمی و ذہنی بیداریاں

جس طرح شب کی ڈراونی ظلمتوں کے بعد صبح کی عالم آرا طلعتوں کا جلوہ فرما ہونا، موسم گرما کی ہوشربا شدت کے بعد ابر بہاری کی حیات آفریں ترادش سے سوکھے ہوئے درختوں سے سبز و شاداب کونپلوں کا پھوٹ آنا، اور موسم بہار ان کے لطافت بیز اثرات سے زمین کی خشک وسعتوں سے رنگا رنگ روئیدگیوں کا ایک فردوس منظر سماں پیدا ہو جانا قدرت کی دلکشا فیاضیوں کا ایک کبھی نہ بدلنے والا ضابطہ ہے، ٹھیک اسی طرح انسانی نشو و نما، تہذیب و ترقی، تمدن و معاشرت، اور اجتماعی زندگی کا عروج و نمو، فطرت کے ایک ایسے ہی غیر محسوس مگر اٹل قانون کا پابند و تابع ہے اور اسی قانون کا اصطلاحی نام "ارتقار طبعی" ہے، پس وقت آتا ہے کہ انسانی جماعتیں اسی قانون کے تحت کہیں ذلت و نکبت کے عمیق غار میں گر کر ہمیشہ کے لیے فنا و تباہ ہو جاتی ہیں اور کہیں ایسی ہی جماعتیں ہوتی ہیں جو عروج و کامرانی کے فلک الافلاک پر ایک درخشندہ تارہ کی طرح جگمگا اٹھتی ہیں۔ غرض انسانی عروج و زوال کے اسی طبعی دستور کے موافق اگست سنہ ۱۹۱۴ء میں ارض فرنگ میں ایک لیا بھونچال (جنگ یورپ) آیا جس نے اگر ایک طرف یورپ کے ایک کروڑ چودہ لاکھ نفوس انسانی کو غرق فنا کر ڈالا تو دوسری طرف ایشیا کی ان گنت آبادی میں، عزت و آزادی، وحدت و جامعیت، اور اصلاح و بیداری کے وہ روح پرور جذبات پیدا کر دیئے جو کبھی خواب میں بھی نظر نہیں آتے تھے اور ایشیائی اقوام کے یہی وہ بیدار کن جذبات ہیں جو کہیں "قومی جمہوریتوں" کی شکل میں نمودار ہیں تو کہیں علمی و فنی ترقیوں اور ملکی و اجتماعی ہیئت و تنظیم کی صورت اختیار کر رہے ہیں اور بہ اعتبار نتائج و اثرات جنگ یورپ نے آج ایشیائی اقوام میں جو نئی روح پیدا کر دی ہے، وہ حقیقتاً اسی طبعی ارتقار کا ایک لازمی مظاہرہ ہے جو ایشیائی آبادی میں عام انسان کی طرح ودیعت تھا، مگر تیز رفتاری یا اس کا ظہور و وقوع ایک بیدار کن حادثہ کا محتاج تھا،

الغرض سنہ ۱۹۱۴ء سے لیکر سنہ ۱۹۲۴ء کی یازدہ سالہ مدت میں ایشیا تہذیب و تمدن اور سیاست و قومیت کی جس حیات بخش جد و جہد کی طرف مائل ہوا اس میں جنگ و پیکار کے ساتھ ساتھ انسانی ترقی کا ایک آلۂ کار، علم و حکمت اور کسب کمالی بھی قرار دیا گیا، چنانچہ تمام ممالک روس کی نوخیز جمہوریتوں سے لیکر ٹرکی و افغانستان کی آزاد حکومتوں

اور مصر و ہندوستان کی پابند آبادیوں میں جاؤ، اور دیکھو کہ یہاں علوم و معارف آموزی ایجاد و اختراع، اور صنعت و تجارت کا ایک دماغی معرکہ برپا ہے جہاں ہر قوم چاہتی ہے، کہ ارض مغرب کی خون آشام فتوحات کا جواب تلوار و توپ سے نہیں بلکہ علم و کمال اور صنعت و تجارت کی لازوال قوت سے دیا جائے۔

پس علمی و ذہنی تحریکات کی یہ وہ نشاۃ ثانیہ ہے جو جنگ فرنگ کے حیرت انگیز اثرات سے ایشیا میں رونما ہوئی، پھر کیسے ہو سکتا تھا کہ وسعت آباد ہند کے افراد اس دماغی اور ارتقائی کشمکش سے متاثر نہ ہوتے؟ آخر کار وقت آ گیا کہ ہندوستان میں جہاں قومی و ملکی تحریکات کا ایک حشر انگیز معرکہ شروع ہوا وہاں مختلف و متعدد جوامع علمیہ کا آغاز و افتتاح بھی عمل میں لایا گیا تاکہ افراد ہند ایشیا کی اس جدید بیداری اور عملیت میں کسی سے پیچھے نہ رہ جائیں چنانچہ ۱۹۱۸ء کے بعد سے ہندوستان میں قومی بیداری اور حصول حریت کے تہلکہ انداز معرکوں کے ساتھ ساتھ آپ نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ ایک جماعت اٹھی اور اس نے خالص علمی و ذہنی ذرائع کو ملک و ملت کی نجات و کامرانی کا صحیح ذریعہ قرار دیکر فیصلہ کر دیا کہ اگر ہمیں دنیا میں عزت و آزادی اور فراغت و خوشحالی کی زندگی درکار ہے تو ہمارا ہر قدم حصول علم و کسب کمال کی طرف بڑھنا چاہیئے چنانچہ بنارس میں ہندو یونیورسٹی، علیگڈھ میں مسلم یونیورسٹی، امنیشل یونیورسٹی، اور برٹش انڈیا کی حدود میں ایسے متعدد جوامع علمیہ قائم کر دئیے گئے جن کی تاریخ افتتاح حادثۂ فرنگ کے بعد ہے، اور جو حامل و ناشر ہیں علمی و ذہنی مقاصد و اثرات کے۔

لہٰذا ارض ہند کی اس ذہنی بیداری کے ساتھ ممکن نہ تھا کہ ہندوستان کا وہ خطہ جسے عرف اصطلاح میں "دیسی ریاستیں" کہا جاتا ہے ان طبعی اثرات سے متاثر نہ ہوتا لہٰذا ہوا کہ اس حصہ میں ایک خالص ذہنی تحریک پیدا ہوئی جسکی رفتار گو غیر محسوس مگر نہایت سریع تھی چنانچہ حیدرآباد میں "عثمانیہ یونیورسٹی" سے لیکر کشمیر و جموں وغیرہ میں متعدد علمی مراکز کا قیام و ظہور انہیں طبعی اثرات کے عملی نتائج ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ یہ کسی طرح صحیح نہیں کہ ایشیا کی موجودہ جد و جہد یا اسکی علمی و فنی بیداری ایشیائی افراد میں فرداً فرداً پیدا ہو گئی بلکہ موجودہ انقلاب و بیداری کے حامل و مبلغ چند مافوق الفطرت دماغ ہیں جنکی رہنمائی میں آج ایشیائی اقوام سرگرم کار ہیں، لہٰذا غلط نہیں کہ ٹرکی میں مارشل مصطفےٰ کمال پاشا کی جنگی سرگرمیوں کی تہ میں ٹرکی قوم کی وہ دماغی بیداری کام کر رہی تھی جسکی روح "مکتب سلطانیہ" سلطان عبد الحمید خاں، نامق کمال، عبد القادر حامد بے، اور خالدہ ادیب خانم، ایسی علمی ہستیوں نے اپنی دماغ آرا تعلیمات کے ذریعہ پیدا کر دی تھی، روس میں کامریڈ لینن، و ایم ٹراٹسکی کی انقلابی قیادت میں لینن و ایم ٹالسٹائی، اور علامہ موسیٰ جار اللہ کی تلقینی اثرات کو بہت زیادہ دخل حاصل ہے، افغانستان

میں معارف گستر امان اللہ خاں غازی کے ساتھ علامہ محمود طرزی کی حیات آفرین تعلیمات افغانی قوم کی موجودہ بیداری کا باعث ہیں۔ مصر میں زغلول پاشا کے ساتھ مصطفےٰ کامل مفتی محمد عبدہ کی تعلیمات جلوہ فرمائے عمل ہیں، ٹھیک اسی طرح اسلامی ہند کی دیسی ریاستوں میں دانش آگاہ نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ کا نام اُن خالص علمی اکابر مصلحین میں شمار کیا جاتا ہے جنکی معارف بیز خدمات کی تاریخ نہایت قدیم اور اُن کے علمی کارنامے نہایت روشن ہیں اور اس امر واقع کی صحت کے لیئے شواہد و حالات موجود ہیں کہ دولت عالیہ اسلامیہ بھوپال کے سابق تاجدار جن خالص علمی و مذہبی روایات و آثار کے ناموراحامل ہوگزرے ہیں اُن کے فروغ وارتقا اور عہد حاضر کی تمام ضروریات علمیہ کی نشر و ترویج میں بیگم صاحبہ اطال اللہ عمرہٗ نے ایک ایسی قابل احترام سبقت حاصل کی ہے جو تاریخ وطنی میں ایک بالکل ہی جدید اور تابناک باب کا اضافہ کرنے والی ہے۔

علیا حضرت حضور فرمانروائے بھوپال کا بست و چہار سالہ عہد حکمرانی جن معارف بیز ایام کا جلوہ بردار ہے اُسکی دماغ آرا تفصیلات پر تاریخ وطن ہمیشہ اپنی تنگ دامنی کی گلہ گزار رہے گی، البتہ ۱۹۱۴ء کے بعد وہ علمی آثار جو حدود بھوپال میں ظہور پذیر ہوئے اور جنہیں میں نے ایشیا کی موجودہ نشاۃ ثانیہ کی تاریخ مطابقت سے جمع کیا ہے، عہد سلطانی کی وہ خالص علمی و ذہنی برکات ہیں جن کا آغاز کار علیا حضرت کے عہد جلوس ہی سے کار فرما ہے۔ لیکن بھوپال وافراد کی جدید ترقیوں کے متعلق تبصرہ کرتے وقت بیجا نہ ہوگا، اگر ممدوحۂ گرامی کے جگر گوشوں نواب عالیجاہ وسیعہد بہادر غفراں مکاں، نواب محسن الملک بہادر فردوس مکاں، اور لفٹننٹ کرنل افتخار الملک بہادر بی اے دام اقبالہ کا نام بھی لیا جائے، جنکی علمی توجہات نے بھوپالی ترقیوں میں سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔

تعلیمات

۱۹۱۴ء جس طرح ہندوستان کی آبادی کا کوئی ممتاز عہد بیداری نہیں اسی طرح بھوپال میں اسوقت علوم ومعارف آموزی کے چرچے سرکاری حدود سے آگے نہیں بڑھے تھے، اُن چند جدید رنگ کے مدارس و مکاتب کے سوا جو سرکاری تھے عموم بھوپال کے ذوقیات کی اصلاح و ترقی کا کوئی "ادارہ عامہ" یا "پبلک انسٹی ٹیوشن" نہیں تھا، گویا علم وفن کے لحاظ سے جو کچھ ہوتا تھا وہ سرکاری حیثیت رکھتا تھا، لیکن وقت آیا کہ علیا حضرت رئیسہ عالیہ بھوپال کے التفات و اعتنا اور دلسوز توجہات سے مذکورہ جمود پرور فضا میں ایک ہلکا سا تموج پیدا ہوا، اگرچہ خفیف سی حرکت بھی انگریزی زبان کی طرف سرعت واقدام تھا، البتہ ۱۹۱۶ء کا زمانہ سرکاری حیثیت سے بھوپال کی علمی و ذہنی بیداری کا ایک نتیجہ خیز زمانہ ہے، جبکہ مشہور قوم پرست فاضل جلیل مرحوم ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری نے بہ ایماء علیا حضرت رئیسہ عالیہ بھوپال، بھوپالی آبادی کی دماغی و ذہنی اصلاح و ترقی کے لیئے "جبریہ تعلیم" کی وہ عظیم الشان اسکیم مرتب کی جس کی تمام تر ترویج علیا حضور رئیسۂ عالیہ

دام اقبالہا کی معارف گستر اور علم پرور اولوالعزمیوں کی مرہون کرم ہے جبریہ تعلیم کے مرتب ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری نور اللہ مرقدہ نے بھوپال کی آبادی کو جس وسیع پیمانہ پر علوم و فنون کی برکات سے بہرہ اندوز کرنا چاہا تھا، و رفیاض طبع رئیسہ عالیہ نے اس جلیل القدر قومی مصلح کی جس فراخ دلی سے حوصلہ افزائی کی تھی وہ ایک داستان ہے جسکی تفصیلات کا یہ موقع نہیں، البتہ راقم الحروف کو غفران مکاں ڈاکٹر صاحب کی زبانی رئیسہ عالیہ کے جن افکار و عزائم کے علم کا شرف حاصل ہے اُس کے اعتبار سے میں کہتا ہوں کہ ہمدرد و سرپرست رئیسہ عالیہ نہ فقط یہ کہ بھوپال کے ہر فرد کو علم و حکمت اور صنعت و تجارت کا خزینہ وار دیکھنا چاہتی تھیں۔ بلکہ اس اسکیم کے ذریعہ وہ رعایائے بھوپال کے اُس مہلک بخار میں ایک علمی روح پیدا کرنے کی متمنی تھیں۔ جس نے عرصہ سے اُن کے قوائے عمل کو مضمحل بنا رکھا ہے، اور یہی غائت تھی روشن خیال و بیدار مغز رئیسہ عالیہ کی تاکہ عوام کو بھوپال میں علمی استعداد اور فنی اہلیت سے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی صحیح قوت پیدا ہو، اور وہ ایک معینہ مدت کے بعد بھوپال کی جغرافی حدود سے نکل کر خدا کی پھیلی ہوئی زمینوں کے ہر حصہ اور بین الاقوامی ارتقاء اور معرکۂ حیات کی ہر جدوجہد میں عملی شرکت کے قابل ہوسکیں پس اس مبارک و مسعود غایت کے ساتھ سنہ ۱۹۱۶ء میں وزارت معارف کو نئی تشکیل و ترتیب دیگئی جس کے صدر ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری، بی اے ایل ایل بی، پی ایچ، ڈی بار ایٹ لا، مقرر کئے گئے، ڈاکٹر صاحب مغفور نے چند مکمل قوانین مرتب فرمائے اور برٹش نظام تعلیم کے ساتھ ساتھ چند مقامی مستثنیات و ضروریات کو ان قوانین میں ملحوظ رکھتے ہوئے اس اسکیم کی منظوری حاصل کی، اس وقت خاص دارالصدر بھوپال میں حسب ذیل دارالعلوم تھے۔

نام	تعداد طلبہ
الگزنڈرا ہائی اسکول	۱۸۹
جہانگیریہ ہائی اسکول	۳۷۲
سلیمانیہ اسکول	۸۳۸
علیدیہ	۱۰۴
شاہجہانی	۲۰
جہانگیر آباد	۷۹
طبیہ آصفیہ	۳۰
سلطانیہ گرلس سکول	۱۱۰
وکٹوریہ	۸۱

سکندریہ ۲۰

جامعہ احمدیہ

قریب تھا کہ فاضل ڈاکٹر عبدالرحمٰن مرحوم کی اسکیم نفاذ پذیر ہو کہ بھوپال میں وبائے انفلوئنزا کا دورہ ہوا، اور نومبر سنہ ۱۹۱۸ء میں اسلامی ہند کی یہ مایۂ صد ناز ہستی خدا کی رحمتوں کے آغوش میں لے لی گئی کثر اللہ امثالہ

بہرحال اولو العزم رئیسہ دام اقبالہا نے مرحوم کی اسکیم کو اسی پیمانہ پر جاری رکھتے ہوئے جولائی سنہ ۱۹۱۹ء سے اس کا نفاذ منظور فرمایا۔ اور جبریہ قوانین کی رو سے شہری آبادی کے چہاردہ سالہ بچے حصول تعلیم پر مجبور کئے گئے، شہری آبادی کی مناسبت سے دار الحکومت کو چند حصوں پر تقسیم کر کے ہر حصۂ شہر میں جبری مدرسہ کا افتتاح کیا گیا غیر سرکاری مکاتب و مدارس کے قابل شمول طلبہ جبریہ مدارس میں لے لئے گئے، جہاں افراد بھوپال کے بچوں کو ابتدائی تعلیم مفت و لازمی دیجاتی ہے، اسوقت تک جس قدر جبریہ مدارس شہر خاص میں مصروف کار ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

نام مدرسہ	تعداد طلبہ
شاہجہانی	۲۲۶
حبیبیہ	۱۸۵
رفیقیہ	۲۱۴
وحیدیہ	۲۰۲
رشیدیہ	۲۵۷
سعیدیہ	۲۷۸
برجیسیہ	۱۲۳
سلطانیہ پانیر	۳۴
احمد آباد	۳۵
وحیدیہ صنعت و حرفت	۱۲۵
نارمل	۲۴

ان میں الگزنڈرا ہائی اسکول کی تعداد طلبہ (۱۷۴) اور سلیمانیہ کی ۶۸۵ اور جہانگیریہ ہائی اسکول کی تعداد طلبہ (۴۳۴) ہے۔

دارالحکومت کی طرح مقبوضات بھوپال یا مفصلات بھوپال میں بھی تعلیم کا نہایت مکمل انتظام ہے جسکی نگرانی ناظم ضلع، تحصیلدار، اور انسپکٹر تعلیمات کے ذمہ ہے، اور خود وزیر تعلیمات بھی دورہ کرکے ان مدارس کی پوری نگرانی کرتا ہے، لہٰذا مفصلات و دارالصدر کی تعداد مدارس ۱۹۳ ہے، جنمیں ۱۱ مدارس تعلیم نسواں کے لیئے ہیں، ان میں طالبات کی تعداد ۵۸۹۴ ہے، غیر سرکاری مدارس کی تعداد (۷) ہے جن کے طلبہ ۱۵۶ ہیں۔

مذکورہ مدارس میں..... ٹیکنکل اسکول شہری آبادی کا صنعتی اسکول ہے، جہاں حدادی، نجاری، خیاطی دری بافی، بید بافی، اور رنگائی کی بہترین تعلیم دیجاتی ہے اور جسکی مدت تعلیم (۵) برس ہے۔ باقی مدارس میں ابتدائی مڈل تک کی تعلیم مفت و لازمی دیجاتی ہے، ان مدارس کے طلبہ کو معقول وظائف و انعامات بھی دیئے جاتے ہیں، فارغین کو ہائی اسکول میں داخل کرکے تعلیم کی تکمیل کرائی جاتی ہے۔ نارمل اسکول میں طریق تعلیم کی تکمیل کرائی جاتی ہے، ان مدارس کے سوا مدرسہ طبیہ آصفیہ میں طب قدیم اور ڈاکٹری کی تعلیم دیجاتی ہے، اسی طرح مدرسہ عبیدیہ میں قرآن محترم اور تجوید کی تعلیم دیجاتی ہے، اس مدرسہ کے بانی نواب محسن الملک بہادر فردوس مکان تھے، جامع احمدیہ بھوپال کا وہ عدیم النظیر دارالعلوم ہے جس کے فارغین بخارا اور روس، مصر و افغانستان میں آج بھی موجود و سرگرم عمل ہیں اسمیں دینیات کی مکمل تعلیم دیجاتی ہے

تعلیمات عامہ کے بعد افراد وطن کی ذہنی و علمی تہذیب و ترقی کے لیئے حسب ذیل محاکم کا اجرا بصیرت فروز ہے۔

تالیف و تصنیف

گو اس سے قبل سے منجانب بھوپال گورنمنٹ، "محکمہ تاریخ" ملک کی تالیفی و تصنیفی خدمات و ضروریات کو نہایت شاندار طریق پر پورا کر رہا ہے لیکن سنہ ۱۹۲۰ء میں علیا حضرت رئیسہ عالیہ بھوپال دام اقبالہا کا معارف اندوز التفات "تاریخ تمدن اسلام" کی تدوین کی طرف مبذول ہوا محکمہ تالیف و تصنیف ایک مستقل شعبہ ہے محکمہ تاریخ کا جہاں اسلامی تمدن و آثار کی ایک معرکۃ الآرا تاریخ متعدد جلدوں میں مرتب و مدون کی جا رہی ہے اس محکمہ کے ارکان میں ملک کے متبحر اصحاب علم و فضل کام کر رہے ہیں۔

تاریخ تمدن اسلام میں عہد اسلامی کے جملہ آثار تمدن فراہم کرکے اردو زبان میں مسلمانوں کے سامنے دو

نادر و کمیاب جواہر جمع کر دیئے گئے ہیں جنکی لمعانیاں کبھی ارض مشرق سے لیکر اقصائے مغرب تک نظروں کو خیرہ کر رہی تھیں، اسی کے ساتھ محکمۂ تاریخ نے ۱۹۱۴ء سے لیکر ۱۹۲۴ء تک جو مولفات تیار و شائع کی ہیں اُنکی تعداد ۳۴ ہے، یہ معلوم کرنا بھی حیرت انگیز ہے کہ فرمانروائے بھوپال باوصف سیاسیات عالیہ کے عقل سوز مشاغل کے ایک متبحر و صاحب فکر مصنف و مولف ہیں، چنانچہ اس یازدہ سالہ مدت میں علاوہ گزشتہ تالیفات کے ممدوحہ رئیسہ عالیہ بھوپال کی تصنیفات کی بھی تعداد ۳۷ ہے۔

حمیدیہ پبلک لائبریری

اس سے قبل منجانب بھوپال گورنمنٹ عوام ملک کے علمی استفادہ کے لئے ایک کتاب خانہ تھا لیکن علمی حیثیت یا عوام کی بدمذاقی کی وجہ سے وہ ایک حد تک سرکاری ضروریات کا کتابی ذخیرہ سمجھا جاتا تھا، جس سے عوام کو چنداں دلچسپی نہ تھی، لیکن دسمبر ۱۹۱۵ء میں بایما حضور رئیسہ عالیہ اس کتاب خانہ کی ہیئت میں ایک قیمتی تبدیلی کی گئی، اور کتاب خانہ مذکور کے لئے متصل امپیریل بنک ایک خوشنما اور جدید وضع کی سنگین عمارت بنوائی گئی، اور کتاب خانہ زیر بحث میں بہ تعداد کثیر کتب جدیدہ کا اضافہ کیا گیا جنکی مجموعی تعداد ۱۱۷۱۷ ہے۔

اس کمیاب علمی ذخیرہ کے سوا ایسی غیر مطبوعہ کتب کا ایک کافی ذخیرہ موجود ہے جسکی صحیح تعداد معلوم کرنا محال ہے اسی طرح قرآن مکرم کے بے شمار اور مختلف النوع تراجم و مجلدات کی تعداد بھی ناقابل احاطہ ہے، اس کتاب خانہ کا نام حمیدیہ لائبریری ہے۔ اس گنج شائگاں سے ہر شخص استفادہ کر سکتا ہے، اس لائبریری کا ایک وسیع ہال اکثر مغربی طرز کے علمی جلسوں اور پبلک لیکچرس کے کام آتا ہے، اسی کمرہ میں لائبریری کا یہ ریڈنگ روم ہے، الغرض باعتبار فنون والسنہ بھوپال کا یہ وہ عدیم النظیر کتاب خانہ ہے جو دنیا بھر کی زبانوں اور علوم کے ساتھ اسلامی دوایا عالیہ کے قدیم روایات و آثار کا جامع ہے۔

۱۹۲۴ء میں اس لائبریری میں "ایڈورڈ میوزیم" کا ذخیرہ نوادر و مصنوعات کا ایک حصہ ضم کر دیا گیا ہے جسمیں عجائب ہند کا ایک حیرت فزا ذخیرہ ہے اور اسکی مجموعی تعداد ۴۲۹۹ ہے۔

مجالس عامہ علمیہ

اب عموم بھوپال میں فرمانروائے بھوپال کے معارف بیز التفات سے جو ذہنی بیداری صورت پذیر پائی جارہی ہے اُس کے علمی نتائج گو ابھی ابتدائی مدارج سے گزر رہے ہیں۔ لیکن مستقبل ضرور امید افزا ہے، ابنائے وطن کی نہضت حاضرہ میں خصوصیت سے علیا حضور کی اُس مستعد و روشن خیال گورنمنٹ کو بہت زیادہ دخل ہے جس کے فاضل و مستعد ارکان نے بھوپالی قدامت پسندی کو جدید رنگ میں رنگ دینے کے

لیئے متعدد و مختلف ذرائع اختیار فرمائے، اور علیا حضور دام اقبالہا کے منشاء مبارک کے موافق عوام وطن میں خلاق و تمدن کے بہتر آثار سے دلچسپی کے لیئے جدید طرز تعلیم، جدید مجالس، کلب، سوسائٹیاں اور جدید معاشرت کے رنگا رنگ مظاہروں سے انہیں عہد حاضرہ کی موجودہ ضروریات سے مانوس و واقف کیا۔ پس علیا حضور کی اس متعدد گورنمنٹ کی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے کہ آج ملک میں متعدد و نوخیز جماعتیں نظر آ رہی ہیں جو جدید وضع قطع کے علمی و فنی مشاغل و سرگرمیوں سے اپنی پوری دلبستگی کا ثبوت دے رہی ہیں اور جو اسی وقفہ یازدہ سالہ میں صورت پذیر ہوئی ہیں۔ چنانچہ ایسی ہی علمی مجالس میں سب سے پہلی اور علمی مجلس

دائرہ ادبیہ ہے جس کا انعقاد ۱۹۱۵ء میں ہوا۔ اس مجلس کا مقصد ادبیات وطن کی اصلاح ترقی اور اردو زبان کی خدمت ہے، مقصد کے لحاظ سے یہ مجلس نہایت کامیاب ہے اس نے بھوپال میں متعدد ادبی جلسے کیئے زبان کے اعتبار سے اس کے ارکان کی مطبوعات اور تراجم کی تعداد ۱۳ ہے۔

الکزنڈرا اولڈ بوائز ایسوسی ایشن اس مجلس کا افتتاح جون ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ اس کے ارکان میں الگزنڈرا ہائی اسکول کے قدیم طلبہ اور فارغین کی ایک روشن خیال اور ہونہار تعداد ہے، اس کے سرپرست نواب زادہ افتخار الملک بہادر بی اے صدر اعظم دولت علیہ بھوپال اور صدر جوان بخت و جوان طالع نواب زادہ عالیجناب محمد حبیب اللہ خاں صاحب بہادر بالقابہ ہیں۔ اس کے ارکان کی تعداد (۱۶۶) ہے، اس کے باقاعدہ ضوابط اور سالانہ روداد میرے سامنے ہیں قواعد ۸ فصول پر مشتمل ہیں جنمیں مجلس کے اصول، اغراض و مقاصد کی شرح کی گئی ہے، ان میں خلاقی و معاشی، اخوت، رواداری اور باہمی امداد و معاونت مجلس کے ضروری مقاصد ہیں، غیر مستطیع طلبہ کی امداد و اعانت کے ساتھ تذاکرۂ علمیہ، لیکچرس، مضمون نگاری، دار المطالعہ، کتاب خانہ، اور تالیف و تصنیف اور تراجم مجلس کے وہ روشن ترین مقاصد جن کا عملی ثبوت اس کے متعدد سرگرم ارکان بہم پہونچا رہے ہیں، اسوقت تک مجلس کے تین سالانہ اجتماع ہو چکے ہیں، درمیانی سالوں کو چھوڑ کر ۱۹۲۴ء کی کارگزاریوں میں اس کے نمایاں اور قابل تعریف کارنامے یہ ہیں۔

(۱) وظائف علمیہ - ۵ روپیہ ماہوار جو غیر مستطیع انٹرنس کے طلبہ کو دیئے جاتے ہیں۔

(۲) وظائف علمیہ بیرون بھوپال ۵ روپیہ ماہوار

(۳) لیکچرس (۵) جن میں خواجہ کمال الدین صاحب کا لیکچر خاص ہے

(۴) کتاب خانہ جسکی فراہم شدہ کتابوں کی تعداد (۲۰۸) ہے۔

(۵) دار المطالعہ میں انگریزی و اردو جرائد و رسائل کی تعداد (۱۰) ہے

(۶) تالیف و ترجمہ میں مجلس ہذا نے ایک امریکن مؤلف کی شہرۂ آفاق کتاب "ینود۔ لڈ آف اسلام" کا ترجمہ مکمل کر لیا ہے،
(۷) سرمایہ ۲۹/۳ لما لعہ ہے۔
(۸) علمی موازنہ میں انعامی مضامین کی تعداد (۸) ہے۔
(۹) حصہ تفریحات بھی نہایت مکمل ہے۔
مذکورہ عمال کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ارکان کی سرگرمیاں نہایت کامیاب اور مستقبل تابناک ہے۔

رشیدیہ رائل کلب رشیدیہ رائل کلب حضور گرامی نواب محسن الملک جنرل حافظ حاجی محمد عبید اللہ خاں صاحب بہادر، سی، ایس آئی فردوس مکان کے فرزند اصغر نواب زادہ عالی مرتبت رشید الظفر خاں صاحب بہادر کے اسم گرامی سے منسوب ہے اس کا افتتاح ۱۹۲۳ء میں ہوا۔ اس مجلس کے ارکان کی تعداد ۱۹۲۲ء میں (۳۱) تھی جو ۱۹۲۴ء میں ۸۷ تک پہونچ چکی ہے۔
۱۔ اس کا سرمایہ صامت روپیہ ہے۔
۲۔ مقاصد میں خلاقیات و خدمات عامہ کا وسیع پیمانہ عمل داخل ہے۔
(۳) اس کے کتاب خانہ کی فراہم شدہ کتب کی تعداد ۸۰ ہے۔
۴۔ اس کے دار المطالعہ میں دو روزنامے، دو رسالے، اور دو ہفتہ وار اخبار بھی آتے ہیں۔
۵۔ اس نے لیکچرس کا مفید سلسلہ بھی جاری رکھا ہے جنمیں مولوی محمد ابراہیم صاحب ندوی ایم اے، ایم او، ایل مترجم دار التصنیف حیدرآباد دکن علامہ ابراہیم رشید مکی اور پروفیسر نواب علی صاحب ایم اے کے بیانات نہایت ممتاز ہیں اگرچہ ارکان کی متوسط الحالی اس کے وسیع پیمانۂ عمل میں ایک حد تک حوصلہ شکن رکاوٹ ہے پھر بھی ارکان کی موجودہ سرگرمی اور جد و جہد بے انتہا میار کباد اور اعمال موجب تحسین و آفرین ہیں، خدا استقامت و ثبات عمل کی توفیق دے۔

سعیدیہ ایسوسی ایشن یہ مجلس حضور نواب محسن الملک بہادر، سی، ایس آئی فردوس مکان کے دوسرے صاحبزادہ عالی وقار والا جاہ نواب زادہ سعید الظفر خاں صاحب بہادر بالقابہ کے نام نامی سے منسوب ہے، اس کا افتتاح اگرچہ ۱۹۲۲ء میں کیا گیا لیکن جولائی ۱۹۲۳ء سے اس کا انتساب نواب زادہ ممدوح کے اسم گرامی سے ہوا۔ اور اسوقت سے اسکی علمی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔
۱۔ اس کے ارکان کی تعداد (۱۳۹) ہے۔
(۲) مقاصد میں مذاکرہ علمیہ۔

۳۔ مضمون نگاری

۴۔ دار المطالعہ

۵۔ کتاب خانہ داخل ہو

کچھ دن قبل حالت امید افزا تھی لیکن سنہ ۱۹۲۴ء کا نتیجۂ عمل کسی قدر مضمحل ہو، خدا ارکان میں وحدت خیال، اور حوصلۂ عمل پیدا کرے

سلطان جہاں یونائیٹڈ سروس کلب یہ کلب ارکان حکومت کی تفریحی انجمن ہے جہاں عمال حکومت سیاسیات عالیہ کی دماغ سوز مصروفیتوں کے بعد باہم جمع ہوکر تفریحی مشاغل سے تازگی اور فرحت حاصل کرتے ہیں، مقاصد میں امور سیاست پر تبادلۂ خیالات و مشورت بھی داخل ہو، اسکی عمارت خوشنما اور مختلف مغربی کھیلوں کے کمروں اور ٹینس گراونڈ پر مشتمل ہو، اسمیں ایک دار المطالعہ بھی ہو جہاں انگریزی، اُردو اور ولایتی اخبارات کا نہایت بیش قیمت ذخیرہ ہر وقت ملتا ہو، اس کا افتتاح دسمبر سنہ ۱۹۱۸ء میں ہوا، سرمایہ بھی وافر ہے۔

انجمن وکلاء یہ انجمن وکالت پیشہ افراد کی مخصوص انجمن ہو اس کا افتتاح ۱۶ اپریل سنہ ۱۹۲۳ء کو ہوا، ارکان کی تعداد ۴۲ ہے، مقاصد قانونی ہیں۔ عایا کی قانونی امداد بھی داخل مقاصد ہے، فیس داخلہ ۵ ہے، خدا کرے یہ مجلس کوئی قانونی رسالہ بھی جاری کردے جو رعایا میں قانون وقت کا احترام اور عدالتی امور و ضوابط سے واقفیت بہم پہونچاتا رہے

مجالس عامہ عصریہ سنہ ۱۹۱۹ء بھوپال میں مجالس عامہ کے قیام و ظہور کا ایک اضطراری زمانہ ہو، بارے یہ ہنگامی ازخود رفتگی ایک اصولی صورت میں متشکل ہوئی، اور چند اصلاحی جماعتیں منعقد ہوئیں، چنانچہ ایسی ہی انجمنوں میں۔

انجمن ہدایت الاسلام ہے، یہ مجلس نہایت مقتدر اور عملی مجلس ہو، جس کے مقاصد میں تبلیغ، اصلاح رسوم و اعمال، اور اتحاد و اتفاق کے روشن تر مقاصد ہیں، اس کے ارکان نہایت تندہی سے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں، اس نے چند مدارس بھی قائم کئے ہیں، سرمایہ بھی کافی ہو، مجلس مذکورہ کے متعدد اجلاس ہوچکے ہیں امور عامہ سے متعلق کافی خدمات انجام دی گئیں، مواعظ و نصائح کا سلسلہ بھی جاری ہو، خدا اس کے مقاصد کو کامیاب کرے۔

جمعیت العلماء اس مجلس کا نام "انجمن ہدایت الاسلام" ہو، لیکن ارکان کی خالص مذہبی مرتبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ نام میں نے رکھا ہو، اس مجلس کے مقاصد میں تبلیغ، انسداد منہیات، شعائر دیرینہ کی ترویج، اور اصلاح رسوم، ایسے ضروری اور قابل عمل و احترام اصول داخل ہیں، اس کے ارکان میں بھوپال کے مقتدر علماء و صلحاء شریک ہیں جو بضرورت وقت کے لحاظ سے سرگرم عمل ہیں، اس مجلس کے بہت سے لا معلوم کارناموں کے ساتھ، شادی بیاہ

میں غیر شرعی رسوم کے انسداد اور تھیٹروں، دنگلوں، اور دوسرے لغو اشغال سے مسلمانوں کو باز رکھنے کی خدمات قابل قدر ہیں۔

جمعیت عالیہ اسلامیہ بہ اعتبار اصول و مقاصد، مسلمانان بھوپال کی یہ وہ مجلس ہے جس کے مقاصد بے انتہا مفید و ضروری ہیں، اسکی تہذیب و ترتیب جسقدر اصول اور عہد حاضر کے موافق ہے اُسی طرح اس کے ارکان بھی نہایت معزز اور ذی ہوش افراد ہیں، اس مجلس کی غایت الغایات موجودہ ضروریات کے لحاظ سے "تنظیم" ہے جس کے ذریعہ مسلمانوں کی علمی و ذہنی، معاشی و مذہبی، اور کاروباری زندگی کی اصلاح و ترتیب مقصود ہے اس مبارک و مسعود مقصد کے ساتھ اس کا افتتاح جون ۱۹۲۴ء میں عمل میں لایا گیا، اس مجلس کے ارکان میں ہر کلمہ گو شریک ہے جسکی آخری فیس ۱ر ہے اسکے عہدہ داروں کا انتخاب رائے عامہ کے متعلق ہے، مجلس مذکور نے تقسیم عمل کے لیئے ایک مجلس ماتحت منتخب و معین کی ہے جس کے ارکان حسب ذیل اصول کار کے نگراں و منصرم ہیں۔

ناظم امور مذہبی۔ جو مسلمانوں کے عام دینی امور کی اصلاح و نگرانی کا ذمہ دار ہے۔

ناظم امور تعلیمات۔ جو مسلمانوں کی تعلیمی خدمات کا حامل ہے۔

ناظم امور عامہ۔ جو مسلمانوں کے عام حالات و معاملات کا عقدہ کشا ہے۔

اس مجلس کے رفاہ عام طریق کار ہیں۔ دار المطالعہ کتاب خانہ، لیکچرس، اور تالیف و تصنیف کے ساتھ حفاظت و اشاعت اسلام بھی داخل ہے، فی الجملہ ضرورت و اہمیت کے لحاظ سے یہ مجلس مسلمانان بھوپال کی اجتماعی زندگی کے لیئے نہایت مبارک و کارآمد مجلس ہے، کیا مسلمانان بھوپال بھی اس مجلس کے متعلق اپنے فرائض و ذمہ داریوں کو محسوس کرینگے؟

انجمن تجار اس مجلس کا نام "چیمبر آف کامرس" ہے، اس کا مقصد اہالیان بھوپال کی تجارتی و صنعتی زندگی اصلاح و ترقی اور تجارتی حقوق کا تحفظ ہے اس کا افتتاح اپریل ۱۹۲۲ء میں ہوا، مجلس کے نمایاں مقاصد ملکی صنعت و تجارت کو فروغ اور بیرون ملک تجارتی کوٹھیوں سے تعلقات کا احیاء و قیام ہیں، اس مجلس کے متعدد اجلاس ہو چکے ہیں۔ مجلس ہٰذا کے ارکان کی وہ گرانقدر امداد قابل شکر و تحسین ہے جو انہوں نے قومیات کے ضمن میں متعدد بار بہم پہنچائی۔

مجالس عامہ اہل ہنود بھوپال میں برادران ہنود کی علمی و عملی سرگرمیاں مسلمانوں کے مقابل کہیں زیادہ مرتب و منتظم اور حوصلہ افزا ہیں، اور وہ زندگی کے ہر شعبہ میں پوری سرعت سے گامزن ہیں۔ ہنود بھوپال کا بیداری جس طرح مسلمانوں سے قدیم، اصولی، اور مکمل ہے اُسی طرح اُن کی مجالس بھی مسلمانوں سے قدیم، اور اصولی

ہیں، لیکن چونکہ میں نے مضمون ہذا میں صرف گزشتہ یازدہ سالہ ترقیوں کا تذکرہ ملحوظ رکھا ہے، اسلیئے برادران ہنود کی اُن مجالس عامہ کو چھوڑ کر جو ۱۹۱۴ء سے پہلے قائم ہوئیں صرف ۱۹۱۴ء کے بعد ظہور پذیر ہونے والی جماعتوں کی تعداد و مقاصد یہ ہیں۔

سیوا سمتی یہ مجلس ۱۹۱۷ء میں قائم ہوئی، اس کا مقصد ہندو مسلم سیوا سمتی کے مشترکہ اعمال و مطالب کی تکمیل و خدمت تھا، لیکن بعد میں یہ صرف "ہندو سیوا سمتی" رہ گئی۔ اس کے مقاصد میں غربا کی امداد و اعانت قابل تعریف مقصد ہے۔

ہندو تیوہار سبھا ۱۹۱۸ء میں اس مجلس کا انعقاد و اجراء عمل میں آیا، اس کا مقصد بھی ہندو مسلمان تیوہاروں پر باہمی خدمت و معاونت اور اتفاق و اتحاد تھا اور اسی مجلس کے تحت دسہرہ اور عیدین کے تیوہار نہایت شاندار طریق پر منائے گئے کچھ دن بعد اس کے مقاصد ولیشوں کے ساتھ مخصوص ہونے لگے اور آج کل اس مجلس پر ولیشوں کا اثر غالب ہے۔

ہندو سبھا یہ مجلس ۱۹۲۱ء میں وجود پذیر ہوئی اسمیں زیادہ لوگ طبقۂ ادنیٰ سے تعلق رکھتے ہیں، اغراض و مقاصد برادران ہنود کی دینی و دنیوی صلاح و تنظیم اور ہندو مذہب کی نگہداشت وغیرہ ہیں۔

لوئیک منڈل ۱۹۲۲ء میں قائم ہوا، اغراض و مقاصد کے لحاظ سے اسے سیوا سمتی کا پاکٹ اڈیشن سمجھیے یہ ہندو سبھا کے تحت کام کرتا ہے

کالیستھ کمار سبھا اس مجلس کا قیام ۱۹۲۳ء میں عمل پذیر ہوا۔ یہ بھوپال کے اُن افراد کی مخصوص مجلس ہے، جنہیں غالب مرحوم نے "اردوئے معلیٰ" میں "لالہ لوگ" لکھا ہے منشاء آفرینش یہ ہے کہ کالیستھ حضرات میں قومی و علمی احساس پیدا کرایا جائے۔

مکاتب عامہ نہضت حاضرہ کے نتائج اور علیا حضور دام اقبالہا کی معارف نیز الطاف میں چند مکاتب بھی ہیں جو ۱۹۱۴ء کے بعد بھوپال میں قائم ہوئے، ان میں سے بعض ہندو مکاتب کی تعداد تقریباً تعلیمات عامہ کے سرکاری اعداد میں آچکی البتہ مسلمانوں کے جدید قائم شدہ مدارس میں مدرسہ

انوار العلوم ہے جس نے عربی فارسی تعلیم کو جدید طرز اور جدید ضرورت کے موافق اجراء کرنے کا تہیہ کر لیا ہے، اسکا افتتاح ۱۹۲۰ء میں ہوا۔ جس طرح ضرورت و فائدہ کے لحاظ سے یہ مدرسہ نہایت اہم و مفید ہے اُسی طرح اس کے نتائج عمل بھی بے انتہا خوشگوار اور حوصلہ افزا ہیں۔ مثلاً اس کے ابتدائی طلبہ کی تعداد ۱۳ تھی

جواب ۵۰ تک پہونچ چکی ہے، مدرسہ زیر بحث میں، ادب، اخلاق، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تاریخ اور مناظرہ کے وہ گراں مایہ علوم پڑھائے جاتے ہیں، جن سے آج اسلامی طبقہ یکسر عاری نظر آتا ہے، اس مدرسہ نے اسوقت حسب ذیل طلبہ تیار کیئے ہیں۔

عربی ترجمہ و مضمون نگاری میں۔۔۔۔(۵)

فارسی میں منشی پاس شدہ۔۔۔۔۔(۵)

منشی عالم کے لیئے۔۔۔۔۔۔۔۔(۳)

مدرسہ کا نظام اوقات ۷۔تا ۹ بجے شام ہے مصارف ماہانہ عہ چار مدرس ہیں جنمیں سے دو بلا معاوضہ اس مبارک خدمت کو انجام دیتے ہیں۔ کاش مسلمانان بھوپال اس مدرسہ کی طرف متوجہ ہوں۔

مدرسہ مجیدیہ ترکی زبان کا مدرسہ ہے، اس کا افتتاح ستمبر ۱۹۲۳ء میں ہوا۔ طلبہ کی تعداد ۲۲ ہے ابتدائی سرمایہ (ماعہ)

مدت تعلیم۔ ایک سال

فیس داخلہ　　عا

ماہانہ فیس　　عہ

اوقات تعلیم ۷۔تا ۹ شام

مدرسہ کی ضرورت نہایت اہم اور قابل اعتنا ہے، نتائج کے لحاظ سے اسوقت تک درجہ دوم کی تعلیم ختم ہوگئی ہے۔ آئندہ نصاب تعلیم مرتب ہوجانے کے بعد تعلیم شروع ہوگی، ابتدائی طلبہ زیر تعلیم ہیں۔

صحافت بھوپال کی ذہنی و علمی ترقیوں میں صحافت وطنیہ کی ترقی فرمانروائے بھوپال کی علمی توجہات کا بصیرت فروز مظاہرہ ہے:۔

ظل السلطان چنانچہ بھوپال کا سب سے پہلا مجلہ ماہی "ظل السلطان" ہے جو ۱۹۱۳ء سے زیر ادارت منشی محمد امین صاحب زبیری مہتمم تاریخ جاری ہے۔ لیکن درمیانی وقفہ تعطل کے بعد ۱۹۲۳ء سے پھر نہایت پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اور ملک کی نسوانی بیداریوں میں اس رسالہ کی کوششوں کو بہت زیادہ دخل ہے۔ رسالہ مذکور کو علیا حضور رئیسہ عالیہ کی سرپرستی کا شرف حاصل ہے، اس رسالہ کا حصہ عالم نسواں نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہوتا ہے

نگار بھوپال کا دوسرا مجلہ علمیہ وادبیہ "نگار" ہے جو فروری ۱۹۲۲ء سے آگرہ سے جاری ہوا، اگرچہ اصلی محل ادارت تو پہلے ہی سے بھوپال تھا لیکن وہ ۱۹۲۳ء سے مستقلاً بھوپال سے شائع ہو رہا ہے اسکی علمی معلومات بالخصوص بہرۂ تراجم نایاب ہوتا ہے اشاعت کے لحاظ سے "نگار" تمام رسائل میں کثیر الاشاعت کہا جاتا ہے۔ اس کا مقصد علم وادب کی خدمت ہے ——————— ایڈیٹر میرے مکرم دوست مولانا نیاز فتحپوری ہیں جو نہایت کاوش سے اس پرچہ کو مرتب فرماتے ہیں۔

ندیم اس رسالہ کا اجرا اکتوبر ۱۹۲۲ء میں ہوا، جو میرے فاضل دوست مولوی سعید رزمی کی تنہا کوششوں کا نتیجہ تھا، رسالہ مذکور کا مقصد زبان کی خدمت اور فوقیات عامہ کی اصلاح تھا، لیکن افسوس کہ تین نمبر شائع ہونے کے بعد یہ رسالہ محض طباعتی مشکلات کے باعث بند ہو گیا۔ لیکن مقام مسرت ہے کہ ایڈیٹر ندیم اسے دوبارہ زندہ کرنے کے لیئے نہایت عزم وحوصلہ سے سرگرم سعی ہیں خدا کرے وہ کامیاب ہوں۔

محسن الملک یہ رسالہ نواب محسن الملک فردوس مکاں کے قومی خطاب سے منسوب ہے اور ستمبر ۱۹۲۴ء سے زیر سرپرستی عالی وقار نواب زادہ سعید الظفر خاں بہادر باقاعدہ اشاعت پذیر ہے، رسالہ کا اصولی مقصد، علمی ادبی خدمت ہے

مطابع ۱۹۲۴ء سے قبل صرف مطبع سلطانی طباعتی ضروریات کا کفیل تھا لیکن ۱۹۲۵ء سے اسوقت تک تین مطبع۔ حمیدیہ آرٹ پریس، عبیدیہ اسٹیم پریس، علوی پریس، کے نام سے قائم ہو چکے ہیں، انمیں عبیدیہ پریس مشین واسٹاف اور کام کے لحاظ سے خاص وقعت رکھتا ہے۔

رعایائے بھوپال ذہنی بیداری کے اس دور سے گزر رہی تھی کہ خدا کی برکت ورحمت کا ایک ابر آیا جسکی بارش نے فضا بھوپال کا نقشہ بدل کر رکھدیا، یہ ابر کرم نواب محسن الملک بہادر فردوس مکاں کی معارف پرور ذات تھی، جس نے رعایائے بھوپال کی تہی مائگی وذہنی بے بضاعتی سے متاثر ہو کر چار لاکھ روپیہ کا تعلیمی گرانقدر وقف فرما کر اپنی غیر معمولی فیاضی کا وہ عدیم النظیر ثبوت دیا ہے جس سے بھوپال کی علمی تاریخ کے اوراق ابد الآباد تک روشن رہینگے۔

چنانچہ اسی وقف کا یہ نتیجہ ہے کہ آج بھوپال کے متعدد طلبا یورپ، امریکہ اور مصر میں سرگرم تعلیم ہیں، جنکی ذات سے بھوپال کا روشن مستقبل وابستہ ہے۔

خدا مرحوم کو جزائے خیر دے اور فرمانروائے بھوپال ونواب زادگان عالی وقار پر اپنی برکتیں نازل فرماتا رہے

ملا رموزی توحیدی

بابر

بابر ۶ محرم سنہ ۸۸۸ھ کو بروز جمعہ پیدا ہوا۔ سلسلۂ نسب باپ کی طرف سے پانچ پشت کے بعد تیمور لنگ اور ماں کی جانب سے چودہ پشت کے بعد چنگیز سے ملتا ہے۔ باپ عمر شیخ مرزا حاکم فرغانہ جنگجو اور مشہور جوان تھا جو ہمیشہ اپنے تینوں بھائیوں کا کوئی نہ کوئی علاقہ دبانے کی کوشش میں رہا اسی بنا پر تینوں بھائی بھی اس کے دشمن ہو گئے۔ اور بمصداق "تنگ آمد بجنگ آمد" سلطان احمد مرزا نے اسپر حملہ کرکے شکست دی گو یہ یونس خاں اپنے خسر کی امداد سے کسیقدر علاقہ پر قابض رہ سکا۔ بابر باپ کے ساتھ ہر معرکہ میں شریک تھا اور طریق جنگ میں اسی کا متبع تھا۔

عمر شیخ مرزا نے کچھ دنوں ٹھہر کر پھر بھائیوں پر حملہ کردیا۔ اس مرتبہ تینوں بھائی سلطان احمد مرزا فرمانروائے سمرقند و بخارا، سلطان محمود مرزا حاکم بدخشان و ختن الغ بیگ مرزا شاہ کابل و غزنین اور عمر شیخ مرزا کے سالوں سلطان احمد مرزا اور سلطان محمود خاں، متحدہ طاقت سے مدافعت کرکے اس فتنہ کو ہمیشہ کے لیئے فنا کردینا چاہتے تھے۔ آخرکار سخت لڑائی ہوئی اور عمر شیخ مرزا کے قبضہ سے بہت سا ملک نکل گیا۔ مگر اسی اثنا میں اتفاقیہ طور پر کبوتر خانہ کی چھت گرجانے سے وہ بھی ناگہاں موت کا شکار ہوا۔

بابر جانشین ہوا اسوقت اسکی عمر ۱۱ برس ۶ مہینے کی تھی اور اندجان میں موسم گرما بسر کر رہا تھا۔ ہرچند بابر تین طرف سے نرغہ میں گھرا ہوا تھا تاہم چند اتفاقات سے اسے ضرر نہ پہونچا اس کے دونوں ماموں اپنے بہنوئی کے مرتے ہی اتحادت الگ ہوگئے چچاؤں کی آتش عداوت بھی سرد پڑ گئی سلطان احمد مرزا نے بابر سے صلح کرلی اور سلطان محمود کا حملہ بغرض لشکر کشی وہاں بابر کے بھائی جہانگیر کی موجودگی سے ناکام رہا جس سے بددل ہوکر وہ بھی واپسی پر مجبور ہوگیا۔ ابابکر دغلت نے بھی تنہائی سے گھبرا کر صلح کرلی اور اس طرح بابر کو داخلی انتظامات کے لیئے کافی موقع ملگیا

کچھ عرصہ بعد سلطان احمد مرزا مر گیا اور اسکے ملک پر سلطان محمود مرزا نے قبضہ کرلیا۔ اور یہاں کی چند افواج تیار کرکے بطور حفظ ماتقدم بابر پر حملہ آور ہوا حسن یعقوب حاکم اندجان اس سے مل گیا۔ بابر کی شکست یقینی تھی لیکن اپنے بھائی کی طرح اس کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس کے پانچ لڑکوں میں سے بیسنقر مرزا کو تخت پر بٹھایا گیا، عین اس نوبت پر چند برلاس کی شرارت سے محمود خاں نے اسپر حملہ کردیا۔ مگر بیسنقر نے بے جگری سے لڑکر محمود کو بھگا دیا۔ ابھی بیسنقر اچھی طرح سنبھلا بھی نہ تھا کہ اسے داخلی خارجہ دشمنوں سے گھرا ہوا پاکر بابر نے حملہ کردیا سال بھر تک لڑائی ہوتی رہی اور بالآخر ۱۴۹۷ء

میں بابر سمرقند پر قابض ہوگیا۔ مگر یہ فتح پائدار نہ تھی۔ سلطان احمد تنبل نے جہانگیر کو تخت نشین کرنے کے بہانے سے کچھ روز کے محاصرہ کے بعد اندجان فتح کر لیا، اور بابر جب سمرقند چھوڑ کر اندجان کی طرف بڑھا تو سمرقند پر سلطان علی مرزا قابض ہوگیا اور اسی سلسلہ میں بابر کے پاس سے تمام مقبوضہ علاقہ جاتا رہا۔ صرف ایک گاؤں جو خجند (قوقند) باقی رہ گیا تھا جہاں اسنے بہزار کس مپرسی موسم سرما بسر کیا۔ موسم گرما شروع ہوتے ہی تنبل کے چند سرداروں نے خفیہ طور پر بابر کی اطاعت قبول کرکے اسے دوبارہ قسمت آزمائی کا موقع دیا، اور متعدد بار لڑائیاں لڑتے لڑتے ۱۴۹۸ء میں بابر کا اپنے ملک فرغانہ پر قبضہ ہوگیا، لیکن چین اب بھی نصیب میں نہ تھا علی دوست طغائی اور قنبر علی نے بابر اور جہانگیر کو آدھی آدھی سلطنت بانٹنے کے لیئے بغاوت کردی اور باغی اپنے ارادہ میں کامیاب ہوئے ادھر سمرقند پر شیبانی قابض ہوگیا یہ دیکھکر بابر نے حصار کی جانب پیشقدمی کی، لیکن ناکام رہا پھر سمرقند پر حملہ کرکے اسے فتح کرلیا، مگر تھوڑے دنوں بعد ازبکوں نے شیبانی کی ماتحتی میں مکرر سمرقند پر ہجوم کیا۔ بابر نے گھبرا کر تیموری اعزہ سے مدد مانگی مگر کسی نے مدد نہ کی جسکی وجہ سے بابر کو نہ صرف سمرقند سے ہاتھ دھونا پڑا۔ بلکہ اپنے حصہ کا موروثی ملک بھی اپنے بھائی جہانگیر کے حوالہ کرنا پڑا جب اس کے پاس ایک بچہ زمین بھی نہ رہی تو یہ اپنے ماموں محمود خاں کے پاس تاشقند چلا گیا اور مدت بعد فوجی امداد لیکر فرغانہ پر اوزکنت کی جانب سے اور دونوں ماموؤں نے مرغلان کی سمت سے بڑھنا شروع کیا اور ان مقامات پر قابض ہوگئے۔ یہ دیکھکر تنبل نے فوراً اکشی اور اندجان کی طرف بڑھ کر اول تو بابر کی پیشقدمی روک دی اور بعد میں اسے اوزکنت چھوڑ کر پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا، لیکن اس عرصہ میں بابر کے دونوں ماموں احمد خاں و محمود خاں سیلاب کی طرح بڑھے چلے جارہے تھے اور جنہوں نے اکشی پر قبضہ بھی کرلیا تھا، بابر نے زچ ہوکر اپنے دشمن شیبانی سے مدد مانگی چنانچہ ازبکوں نے بھی فرغانہ کی طرف بڑھنا شروع کردیا لیکن تنبل نے شیبانی کی سرحد پر پوری مدافعت کی اور ملک میں گھسنے نہ دیا اور ادھر اُدھر زبردست دباؤ سے دونوں ماموں بھاگ گئے، اور اکشی سے بابر بھی پسپا ہوگیا، کچھ دن ٹھہر کر دوبارہ دونوں ماموؤں نے پھر حملہ کیا مگر دونوں کام آگئے اور بے یار و مددگار بابر کو صحرائی زندگی بسر کرنی پڑی اب وہ پے در پے شکستوں سے اکتا گیا تھا اسلیئے اسنے کسی جدید جگہ تقدیر آزمائی کی ٹھانی جہاں اپنے قدیم بے تعداد دشمنوں سے بھی محفوظ رہے ایسی جگہ اسے ہندوستان ہی نظر آئی اور بغیر کابل پہونچے ہندوستان تک رسائی ناممکن تھی، اسلیئے اسے فتح کابل کی دھن بندھی۔

کابل اور غزنین پر بابر کا چچا الغ بیگ مرزا حکمراں تھا جب یہ ۱۵۰۱ء میں مرگیا تو اسکے بیٹے کی کمسنی کی بناء پر ملک میں طوائف الملوکی کا بازار گرم ہوگیا ہر سردار طاقت جمع کرکے فرمانروا بن بیٹھا تھا آخر محمد مقیم ان سب پر غالب

آیا اور الغ بیگ کی لڑکی سے شادی کرکے کابل پر حکومت کرنے لگا۔

بابر نے گاؤں اور قصبوں میں پھر کر کچھ سپاہی جمع کئے کابل کی طرف کوچ کیا اور سرحد پر مقیم کے سردار شیرک کو شکست دی اور بعد میں مقیم کو بھی شکست دیکر کابل و غزنین کا مالک ہوگیا، اسوقت وہ اپنے کو بہت مسرور و مضبوط پاتا تھا اسے اپنے عظیم مقصد میں کامیابی ہوئی تھی ورا ایک طرف سمرقند اسکے رحم پر تھا اور دوسری جانب براعظم ہندوستان اسکا معنوی طور پر خیر مقدم کر رہا تھا سال بھر کی تیاری کے بعد اسنے درہ خیبر میں داخل ہوکر کوہاٹ کا رخ کیا اور سندھ تک بڑھتا چلا گیا لیکن یہاں سے اسے بدخشاں پر سے ازبکوں کا قبضہ اٹھانے کے لیئے جنہوں نے اسکی عدم موجودگی میں قبضہ کرلیا تھا واپس ہونا پڑا۔

سنہ ۱۵۰۵ء میں اسنے قلات پر حملہ کیا اور پھر دوسرے مقامات پر بھی چھوٹے چھوٹے حملے کرتا رہا۔ ابھی وہ ہندوستان پہونچنے کی بے پود کوشش کر ہی رہا تھا کہ سلطان حسین مرزا کی طرف سے تیموری خاندان کے تمام ممبروں کو اسکی سرداری میں ازبکوں سے فیصلہ کن جنگ کرنے کی دعوت دی گئی، بابر نے منظور کی لیکن حسین مرزا کی موت سے یہ تجویز معرض التوا میں پڑ گئی، اور بعد میں اس کے بیٹوں کی کوششوں سے تیموری سرداروں کا ایک اجتماع عام عمل میں آیا، چنانچہ شیبانی کے بلخ تک بڑھ آنے سے تیموری فوجوں نے بھی جائے اجتماع ہرات و مرغاب و بدخشاں وغیرہ سے بڑھنا شروع کیا لیکن عین اس نوبت پر بابر اپنی چچا زاد بہن معصومہ سلطانہ کے عشق میں مبتلا ہوگیا اور حسن دلنواز نے اس کا سارا جنگی جوش ٹھنڈا کردیا ادھر اسکی غیر حاضری میں کابل میں بغاوت ہوگئی اور باغیوں نے محمود مرزا کے بیٹے ولیس خاں کو کابل کا حاکم بنا دیا جب بابر کو اسکی خبر ہوئی تو اس کا سارا عشق رفوچکر ہوگیا اور آندھی کی طرح کابل آکر بغاوت فرو کی، اسی اثنا میں متعدد تیموری فوجوں نے شیبانی سے شکست کھائی، اور بجز کابل اب تیموری خاندان میں کوئی قطعہ زمین باقی نہ رہا بابر اس موقعہ پر بہت گھبرایا وہ سمجھتا تھا کہ شیبانی امروز فردا میں مجھ پر بھی حملہ کیا ہی چاہتا ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا، بابر بڑی جی داری سے لڑا جس سے شیبانی کو کامیابی نہ ہوئی۔ اسی دوران میں الغ بیگ کے لڑکے عبدالرزاق نے جسے مقیم نے شکست دی تھی علم بغاوت بلند کیا۔ ہر چند بغاوت زبردست تھی تاہم بابر نے تلوار کے زور سے باغیوں کا نظام پارہ پارہ کردیا اور کچھ روز امن و امان سے زندگی بسر کی۔

بابر کو شیبانی کا جو کھٹکا بعض وجوہ سے مٹ گیا تھا ہر دم لگا رہتا تھا اسلیئے اس نے شاہ ایران اسمعیل صفوی کو اسکی قوت توڑنے پر توجہ دلائی جسے شاہ ایران نے منظور کرلیا اور بطور حفظ ماتقدم اچانک طور پر شیبانی پر حملہ کردیا، شیبانی کو اس حملہ کا گمان بھی نہ تھا اسلیئے اسے بہت نقصان اٹھانا پڑا اور خود بھی اسی میدان میں کام آگیا۔ بہنوئی کی موت کی خبر سے بابر کو بڑی

خوشی ہوئی اور وہ اب پھر سمرقند کا خواب دیکھنے لگا، ناصر مرزا کو کابل میں چھوڑا اور کامران و ہمایوں دونوں بیٹوں کو ساتھ لیکر
قندز اور پھر حصار پہونچ گیا۔ ایرانیوں سے شکست کھاکر ہرچند ازبکوں کی طاقت منتشر ہوگئی تھی تاہم بالکل فنا نہ ہوئی تھی
اور ان کی کثرت تعداد سے بابر اب بھی خوفزدہ رہا کرتا تھا اسی عرصہ میں اسکی بہن خانزادہ بیگم شیبانی کی بیوی ایرانی سرداروں
کی زیر نگرانی بابر کے پاس پہونچی بابر نے اس تقریب میں ایرانی فوجی افسروں کی معرفت اسمٰعیل صفوی سے مکرر امداد لینی چاہی
مگر شاہ اسمٰعیل نے اس شرط پر امداد دی کہ بابر جو ملک فتح کرے اسمیں شیعہ مسلک جاری کرے۔ اس کے بعد بابر حصار سے
آگے بڑھکر سرخ آب پر خیمہ زن ہوا ازبکوں کو بابر و اسمٰعیل صفوی کے فیمابین جدید معاہدہ اور ایرانی امداد کا حال معلوم
ہوا تو وہ بہت برہم ہوئے اور انہوں نے سرخ آب پر ایرانی فوجی امداد آنے سے پہلے ہی حملہ کردیا گھمسان کی لڑائی ہوئی
بابر کا پیچھے ہٹنا یقینی تھا مگر موجودہ ایرانی فوج کی کمک آگئی جس سے ازبکوں کو نقصان پہونچا اور پسپا ہونا پڑا، بابر نے
سختی کے ساتھ ازبکوں کا تعاقب کیا، ازبکوں کے کہیں قدم نہیں ٹکے، اور یہاں تک کہ بابر سمرقند کا بھی مالک ہوگیا،
سنہ ۱۵۱۱ء جدید معاہدہ نے بابر کی نیکنامی اور ہردلعزیزی پر برا اثر کیا، ہر شخص ضمیر فروش اور جعفری مذہب کی طرف
مائل سمجھنے لگا تھا،

بہت دن تک ازبک اپنی تباہی خیز شکست کے اثرات دور کرنے میں مشغول رہے مگر پھر عبید اللہ خاں کی ماتحتی
میں انہوں نے سمرقند پر حملہ کردیا۔ اس جنگ میں ازبک اس جی داری سے لڑے کہ بابر کو سمرقند اور تمام دوسرے
شہر چھوڑکر کابل واپس آجانا پڑا۔

اس شکست سے بابر نے سنٹرل ایشیا میں فوجی کارروائی ہمیشہ کے لیئے بند کردینے کا فیصلہ کیا، اور ہندوستان میں
گھسنے کی تدبیریں کرنے لگا اور اس نے پیہم پانچ حملے کیئے پہلا سنہ ۹۱۰ھ میں ملتان پر دوسرا سنہ ۹۱۳ھ میں جھنگرای پر
تیسرا سنہ ۹۲۵ھ میں بھیرائے پر چوتھا لاہور و سرہند پر، اور پانچواں آخری حملہ ابراہیم لودی شاہ ہند پر سنہ ۹۳۲ھ
میں کیا جسے کامیاب کہا جاسکتا ہے

مندرجہ بالا واقعات بابر کے ہندوستان آنے کے اسباب اصلی ہیں بابر یہاں اسے جائے پناہ اور امن سمجھکر آیا تھا
تاکہ ہمالہ اس کے اور قوی دشمنوں کے درمیان ناقابل گذر حد فاصل رہے ہندوستان میں اسے ابتدائی عارضی سلطنت
قائم کرنے میں جو کامیابی ہوئی وہ ناقابل التفات ہے اس زمانہ کے ہندوستان کی تباہ حالت دیکھکر کہا جاسکتا ہے کہ بابر
کی طرح جو شخص بھی آتا وہ اسی طرح کامیاب ہوتا بابر کو خاندان مغلیہ کا بانی کہنا بھی صحیح نہیں کیونکہ وہ بھی اسی طرح آیا
اور خونریزیاں کیں جیسے اسکے ہم قوم مغل سردار تین سو برس سے کر رہے تھے، ہندوستان میں داخل ہونے کے دو چار

برس بعد ہی اس کا انتقال ہوگیا ورنہ اس کا بھی وہی حشر ہوتا جو ہمایوں کا ہوا تھا۔

بابر کی کامیابی کا راز معلوم کرنے کے لیئے اسوقت کے ہندوستان کی حالت کا جان لینا بھی بہت ضروری ہے صحیح معنی میں یہاں اسوقت کوئی حکومت نہ تھی بلکہ طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا، ایک سرے سے دوسرے تک بد امنی اور شورشیں برپا تھیں ہر شہر ہر قصبہ بلکہ ہر گاؤں میں خودمختار حکومت قائم تھی، ہر صوبیدار ہر شہر کے حاکم اور قصبہ کے محافظ کا بادشاہ اور مرکزی حکومت سے صرف اتنا تعلق باقی تھا کہ جنگ کے موقعہ پر تھوڑی سی فوج بطور امداد بھیجدے ابراہیم لودی بوجہ بزدلی اور نااہلیت وعیش پسندی شاہ شطرنج ور مرغ زریں تھا، بادشاہ کے ظلم زیادتی زبردستی سے رعایا پریشان اور تباہ و برباد تھی، راجپوت بے طرح سر اٹھارہے تھے بابر آیا تو سیکڑوں افسر اس سے مل گئے اور جو نہ ملے انہوں نے ابراہیم کو بھی مدد نہ دی ابراہیم کم عقل غیر مدبر اور غیر سیاست داں اور فنون جنگ سے بھی نابلد تھا، اور جنگی تجربات سے بھی کورا اسلیئے شکست کھا کر مارا گیا۔

ان متذکرہ صدر واقعات سے ایک مورخ حسب ذیل نتائج پر پہونچتا ہے

(۱) بابر ذاتی بہادری، جوش وستعدی، جرأت وتہور کا پتلا تھا، جانباز سپاہی کی طرح تلوار کا دھنی اور معمولی فنون حرب کا ماہر مگر انتظامی قابلیت اور تدبر وسیاست سے کورا۔ بنا برین اسکی تمام تر فتوحات کی ناپائدار بنیاد تلوار کی دھار پر قائم تھی۔

(۲) اسنے پبلک تالیف قلوب بہبودی خوشنودی اور رفاہ عام کے کاموں کی جانب بہت کم توجہ کی بخلاف ازیں نوع البشر عموماً مسلمانوں اور خصوصاً اعزہ واقربا کا حصول دولت وعزت اور شخصی وجاہت کے لیئے بیدردی سے خون بہاتا رہا اسکے جنگی اقدامات سے جمعیتہ اسلامی منتشر ہوگئی اور ترقی اسلام رک گئی وہ اخوت ومساوات کے معنی نہ سمجھ کر بانیٔ اسلام کے خلاف جدوجہد کرتا رہا جس سے اجنبی قوموں کو فائدہ ہوا، سوائے مسلمانوں کے غیر قوموں سے بابر کبھی نہیں لڑا راجپوتوں سے لڑائی بطور جملۂ معترضہ ہے۔

(۳) بابر جلد باز مطلب پرست خودغرض اور تھوڑی کامیابی سے بہت خوش ہونیوالا بہادر جنرل تھا، دشمن کی طاقت سے ہمیشہ بے خبر رہتا کبھی حد سے زیادہ طاقت کا اندازہ کرلیتا اور کبھی بہت ہی کم قیاس کرتا اسے ہر شہر کا ملک چھیننے میں فتح کرلینا آتا تھا مگر [illegible] قبضہ قائم رکھنا نہیں۔

نقاد بھوپالی

تخت طاؤس

آہ! اے تخت طاؤس آج تو کہاں ہے، تیری صورت کس کنج عزلت میں پنہاں ہے، ہاں، ہاں، تونے ہندوستان کو کیوں خیرباد کہہ دیا اور کون سے لالہ زار میں اپنا آشیاں بنایا، او بے وفا میں تجھے کدھر ڈھونڈوں، کہاں پاؤں، اف تجھے کیا معلوم کہ تیری یاد نے اسوقت میرے دل میں کیسی تڑپ پیدا کردی ہے، تو وہی تخت طاؤس ہے جسکو، جلال الدین اکبر اعظم کے پوتے شاہجہاں نے اپنے جاہ وجلال کے اظہار کی غرض سے بنوایا تھا، امیر تیمور صاحبقراں کے اس ہر دلعزیز فرزند نے تخت جہانگیر پر قدم رکھتے ہی بے بدل خاں کی زیر نگرانی بڑے ساز وسامان سے تیری تیاری کا اہتمام کیا تھا، ہائے پھر تو کیوں نہ بے بدل ہوتا۔ ایشیا بھر میں تیری خوبصورتی کی دھوم تھی، اور دنیا میں شاذ ہی کسی بادشاہ کو ایسا لاجواب تخت نصیب ہوا ہو تاریخ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تخت طاؤس سوا تین گز طویل ڈھائی گز عریض اور پانچ گز بلند تھا، جسمیں ایک لاکھ تولہ خالص سونا (جو اسوقت ۲۵ لاکھ روپیہ کا تھا) صرف ہوا تھا اور سولہ لاکھ روپیہ کا جواہرات موقع بموقع لگایا گیا تھا، ان میں بیشتر وہ بیش بہا جواہر تھے، جو ہمایوں کے بعد سے عہد جہانگیری تک وقتاً فوقتاً امرائے دربار نے سلاطین ہند کی بارگاہ میں بطور نذر گزرانے تھے۔

تخت پر چڑھنے کے تین مرصع زینے تھے اور اسکے اوپر ایک منقش چھت بارہ زمردین ستونوں پر قائم تھی، گویا وہ تخت کیا تھا ایک مکلف بارہ دری تھی، جسمیں تاجداران ہند جلوہ افروز ہو کر حکم احکام نافذ کیا کرتے تھے۔ شامیانہ کے بالائی حصہ پر بقول بعض مورخین ہر ستون کے اوپر دو مرصع طاؤس بیٹھے تھے اور ان کے درمیان ایک درخت لگایا گیا تھا جسکے تمام پھول پتے مختلف جواہرات سے بنائے گئے تھے، اور یہ غالباً کلغی ومنقار کی قائمقامی کرتے ہوں گے، طاؤس کی دم جو حالت رقص میں دکھائی گئی تھی، بادشاہ کے تکیہ گاہ کا فرض انجام دیتی تھی، جسکی لاگت دس لاکھ روپیہ تھی، اس کے وسط میں ایک درخشاں لعل پیوست تھا جس کا تخمینہ ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ تھا، یہ لعل شاہ عباس صفوی والی ایران نے صاحبقران اعظم شہنشاہ جہانگیر کو تحفتاً بھیجا تھا، تخت کے اندرونی جانب حاجی محمد جان قدسی کے ایک قصیدے میں اشعار کا کندہ تھا، جسکا آخری ”لفظ ”اورنگ زیب شہنشاہ عادل ہے جس سے سنہ ۱۰۶۶ھ تخت کی تاریخ نکلتی ہے۔

علاوہ ازیں شاہجہاں نے تیرے واسطے وہ مقام تجویز کیا جو ابتدائے آفرینش سے شاہان ذی اقتدار کا

پایۂ تخت رہا ہی، تیرے حسن کے دلدادہ آقا نے محض تیری خاطر وہ رشک ارم گلزار تعمیر کرایا جس پر یہ شعر تا ابد ام مصداق ہے،

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

اللہ اللہ وہ بھی کیا زمانہ ہوگا جب ہندوستان کے وزیر اعظم سعد اللہ خاں نے تیری پابوسی کے بعد سب سے پہلے نمک خواری ووفاداری کا خلعت لیا ہوگا۔ کون ہی جو نہیں جانتا کہ شاہزادہ دارا شکوہ نے تجھ پر سجدہ جمانے کے بعد اپنے بھائیوں کے خلاف سازشی کارروائیاں شروع کی ہونگی، اللہ اللہ وہ بھی کیسے قابل دید نظارے ہوں گے جب شاہجہاں کا سب سے لائق جانشین محی الدین اورنگ زیب شہنشاہ عالمگیر کے لقب سے تجھ پر بصد جاہ و حشم متمکن ہوا ہوگا، اور میر جملہ دکن کا شہرۂ آفاق سیاست داں تیرے حلقہ بگوش غلاموں میں نظر آتا ہوگا، اور سیوا جی جیسا سرکش کوہی، تیری ایک نگاہ لطف کا محتاج ہوگا۔

لوگ کہتے ہیں کہ جنگل میں مور ناچا، کس نے دیکھا، مگر نہیں تو آبادی میں ناچا، بھرے درباروں میں ناچا جشن وطرب کی محفلوں میں ناچا اور ایسا ناچا کہ دیکھنے والوں کو مدہوش، اور دنیا کی آنکھوں کو خیرہ کردیا، لیکن بیزاری کی کوئی وجہ بھی، کس چیز نے تجھے ہند کی سرزمین سے متنفر کردیا، آخر کس واسطے تو نے ترک وطن اختیار کیا، سچ تو بتا ایک بہشت بریں کو چھوڑ کر کیا نہال ہوا جو دوسری جنت ارضی کو ٹھکرا کر چلا گیا، ہاں شاید تو اپنی فطرت سے مجبور ہوا ہوگا اور کوئی نیا سبز باغ دیکھکر اپنے بوستان قدیم سے اڑ گیا، مگر یہ تیری بے رخی بے اعتنائی اچھی نہیں" اپنوں ہی سے یہ طوطا چشمی، ارے ظالم تجھکو کس کس ناز و نعمت سے پالا، تیری کیا کیا ناز برداری نہ کی، کوئی دانہ کھلاتا ہی، تیری چونچ موتیوں سے بھری، تیرے نام پر ساڑھے چھ کروڑ روپیہ کا خرچ لکھا ہوا ہی، کیا تیرے پروں میں، عقیق یاقوت زمرد اور فیروزے نہیں ٹکے تھے، اب اس سے زیادہ کیا تجھے کوئی سونے میں تول دیگا۔

آہ شاہجہاں کے تاج کی زینت تجھسے تھی، اورنگ زیب کے تخت کی زیبائش تجھ سے تھی، بابر کی سلطنت کی رونق تیری بدولت قائم تھی، مگر اُف تو بڑا کم ظرف بے مروت نکلا، تجھسے ہرگز ایسے احسان فراموشی کی امید نہ تھی یہ سب سچ ہی لیکن تو پھر پرندہ تھا وہ بھی بھولا بھالا، دنیا کی ہوا تجھکو نہ لگی تھی، تو دام طمع میں گرفتار ہوگیا، غریب لاچار بے بس تھا، آخر کرہی کیا سکتا تھا،

نہیں، نہیں میں اب تک غلط فہمی میں مبتلا تھا، تو نہایت سمجھدار جانور ہی، بالغ نظری اور دور اندیشی تیرا

حصہ ہے، بادلوں کی آواز کو تو دور ہی سے سن لیتا ہے، تو نے ہند کے غبار آلود مطلع میں، اپنے قدردانوں کی قسمت کا فیصلہ پڑھ لیا تھا، مگر وہاں دم مارنے کی مجال نہ تھی اور اگر تو بولتا بھی تو۔ع

صدا طوطی کی سنتا کون ہے نقار خانہ میں

آہ شاہ عالم بہادر شاہ اول کی ناعاقبت اندیشی، جہاندار شاہ کی خود فراموشی اور فرخ سیر کی شہادت نوشی نے تجھکو اور زیادہ برداشتہ خاطر کردیا گو بازیگروں کی کٹھ پتلیاں ہر روز ایک نیا تماشہ تیرے سامنے پیش کرتی ہونگی - جا! عالم محمد شاہ رنگیلے کی عشرت پرستیاں ہر ہر طور پر تجھکو بہلانے کی کوشش کرتی رہتی ہونگی، مگر یہاں تیرا دل ہی اچاٹ ہو چکا تھا، تو مرغ رشتہ بپا کی طرح ہر وقت بیچین و بیکل تھا، آخر خدا بے زبانوں کی بھی سنتا ہے، تیری مراد پوری ہوئی، تیری کشش نے اثر دکھایا، اور قہر خداوندی صورت نادر بنکر، شاہجہاں آباد کی بستی پر نازل ہو گیا۔

اُف عیش و عشرت کی بساط الٹ جاتی ہے، نادری فوج دلی کی شہر پناہ میں داخل ہوتی ہے، دلی نئی نویلی دلی، پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے - اُس کا سالہا سال کا سہاگ چشم زدن میں لٹ جاتا ہے، اور دیکھنے والے منہ پھیر پھیر کر ہنستے ہیں۔ اسکی بیکسی و کس مپرسی پر کوئی دو آنسو بھی نہیں بہاتا، تیرے لیے ایسی حالت میں ذرا سا بھی اشارہ کافی تھا چنانچہ تو اُسی طرح سر جھکائے حیرت و استعجاب کے سمندر میں غرق خاموش اپنے نئے میزبان کے ساتھ ہو لیا۔

جا، اے شاہان مغلیہ کے ناز جا، ایران کے عشرت کدوں میں جا، کجکلاہوں کے محلوں میں جا، طہران گلستان کا تفریح کر اور اپنا دل بہلا، اصفہان جنت نشان کی ہوا کھا، شیراز جنت طراز کی بہار کے مزے لوٹ، ہندوستان کی محفل آرائیاں تجھکو نہ بھائیں نہ سہی، دلی نازآفریں دلی کی قدر و منزلت تجھکو پسند نہ آئی، نہ سہی اسمیں تیری کچھ خطا نہیں، بلکہ تیرا آب و دانہ ہی اس خاک پاک سے اٹھ گیا تھا، خیر خارستان ہند کا چھوڑنا تجھے خدا راس لائے اور بوستان فارس میں جانا مبارک ہو۔

جا جا، ایران والے بھی خاطر تواضع کرنا خوب جانتے ہیں ان کو تیرا چاؤ پیار کرنا آتا ہے، ان کی مہماں نوازی سے سب خوش ہوتے ہیں، تو بھی خوش رہیگا، ان کی عزت سے تو نیکنام ہوگا، تیری دولت کے وہ اصل حقدار ہیں تو بھی ان کو اپنا اہل سمجھ، میرا غم نہ کر میں بھی اپنے دل پر سنگ جبر رکھکر خاموش ہو جاؤنگا۔

مرزا مظفر حسین، علیگ

روح اعظم

زندگی کی ایک ساعت باعتبار وقعت اور اثر کے دوسری ساعت سے مختلف ہوتی ہے، ہمارا ایمان لمحوں کے لیئے آتا ہے مگر ہماری برائیاں دائمی ہیں، تاہم ایمان کے ان مختصر لمحوں میں ایک رمز ہوتا ہے جو ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم بہ نسبت اُن واقعات کے جو ہم پر گذر چکے ہیں، ان مختصر لمحوں کو زیادہ حقیقی سمجھیں، اسی بنا پر یہ دلیل کہ تجربہ حقائق کے پرکھنے کا اصل معیار ہے، ہمیشہ ان لوگوں کے خاموش کرنے کے لئے پیش کی جاتی ہے، جو انسان سے غیر معمولی توقعات رکھتے ہیں، مگر ہمیشہ کے لیئے غلط اور لغو ہو جاتی ہے، اسلیئے ہم زمانہ گزشتہ کو معترضین کے لیئے چھوڑتے ہیں اور آیندہ کے لیئے امید کرتے ہیں۔ ہمیں اس امید کی ضرور تشریح کر دینی چاہیئے، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ انسانی زندگی بے حقیقت ہے، مگر ہمیں کیونکر معلوم ہوا، کہ وہ بے حقیقت ہے؟ ہماری اس تجسس اور دیرینہ بے صبری کی کیا بنیاد ہے؟ ہماری معلومات میں اس کمی اور لاعلمی کا عام مفہوم کیا ہے بجز اس لطیف دعا کے جس کے ذریعہ سے روح خود اتنا بڑا دعوی کرتی ہے؟ آخر انسان کیوں محسوس کرتا ہے کہ اسکی مجمل تاریخ اب تک قطعی نہیں لکھی گئی ہے بجز اسکے کہ جو کچھ تم نے اسکے بارے میں کہا ہے، وہ اُس سے برابر ترقی کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ باتیں جو پہلے اسکی نسبت لکھی گئی تھیں، حصہ پارینہ ہو جاتی ہیں۔ اور الہیات کی کتابیں بیکار سمجھی جاتی ہیں! چھ ہزار برس کے فلسفے نے روح کے نکات اور خزانوں کو دریافت نہیں کیا ہے، اس کے تجربات کی آخری تشریح میں ایک معمہ الیسا رہ گیا جو حل نہ ہو سکا، انسان ایک دریا چشمہ ہے، جس کا منبع نامعلوم ہے، ہماری نسلیں چلی آرہی ہیں مگر یہ نہیں معلوم کہ کہاں سے نہایت صحیح حساب دان بھی یہ نہیں بتا سکتا۔ کہ آنے والے لمحہ میں کیا پیش آنے والا ہے، میں ہمیشہ یہی چاہتا ہوں کہ بہ نسبت اپنی مرضی کے حسکو میں اپنا کہتا ہوں، میں خود واقعات کی زیادہ اصل تسلیم کروں۔

جو باتیں واقعات کے ساتھ پیش آتی ہیں وہی خیالات کے ساتھ پیش آتی ہیں جب میں خیالات کی روانی پر غور کرتا ہوں جو بالکل نامعلوم طریقہ سے تھوڑی دیر کے لیئے میرے اندر موج زن ہوتا ہے، تو اسوقت مجھے معلوم ہوتا ہے کہ خیالات مجھ میں بلا کسی سبب کے آرہے ہیں۔ میں خیالات کے آنے کا کوئی سبب نہیں ہوں بلکہ خیال کی لطیف موج کا متحیر تماشائی ہوں

یہ سچ ہے کہ میں ان کو خواہش سے اور متوجہ ہو کر دیکھتا ہوں اور میری حالت اسوقت انتظار کی حالت ہوتی ہے
مگر یہ یقینی ہے کہ یہ خیالات ایک نامعلوم قوت کے ذریعہ سے آتے ہیں

گزشتہ ادوار یہ غلطیوں پر اعلیٰ تنقید، اور ان غلطیوں کی آگاہی کی طرف غیبی تنقید وہ فطرت عظیم ہے جو ہم کو اسطرح محیط کئے ہوئے ہے جیسے زمین کو کرہ ہوا کی بزم آغوش، یہ وہ وحدت ہے، یہ وہ روح اعظم ہے جسمیں ہر شخص کا اصلی جوہر شامل ہے، اور وہ سب میں مشترک ہو کر ایک ہو گئی ہے، یہ وہ قلب عام ہے جس سے مخلصانہ گفتگو عبادت ہے اور جس کے لئے ہر صحیح کام اطاعت ہے، یہ وہ کامل قدرت والی حقیقت ہے، جو ہماری عیاریوں اور چالاکیوں کا راز کھول دیتی ہے، اور جو ہر شخص کو ایسا ہی بناتی ہے جیسا اسکا اقتضا ہے اور اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو جس کام کے لیئے پیش کرے وہ عملی طور پر کرے، بناوٹ کا اسمیں شائبہ تک نہ ہو، اور جو (روح) ہمیشہ ہمارے افکار و اعمال میں روز افزوں داخل ہوتی رہتی ہے اور دانشمندی، نیکی قوت اور حسن و جمال بن جاتی ہے۔

اگر ہم غور کریں کہ گفتگو کے وقت ہماری کیا حالت ہوتی ہے، خواب بیداری، عالم تاسف کے دوران میں ہم پر کیا گزرتی ہے، غیبت کے وقت، تعجب اور خواب کی حالت میں ہماری کیا کیفیت ہو جاتی ہے، تو ہم کو ان میں ایسے بہت سے نکات ملیں گے، جو فطرت کے پوشیدہ علم میں وسیع اور پر از معلومات ہو جائیں گے۔ ان حالتوں اور ان اوقات میں ہم اکثر دوسرے بھیس میں جلوہ گر ہوتے ہیں مگر یہ عجیب عجیب بھیس ہماری حقیقی کیفیت یا حالت کو صرف بڑھا چڑھا کر اسطرح پیش کرتے ہیں کہ خواہ مخواہ انکی طرف توجہ کھینچ جائے، ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی روح کوئی حواس نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ایسی چیز ہے جو تمام حواسوں کو متحرک کرتی اور کام میں لگاتی رہتی ہے وہ قوت یاد، قوت حساب، قوت مقابلہ کی مانند کوئی قوت نہیں ہے بلکہ وہ ان کو اپنے ہاتھ اور پیر کی مانند کام میں لاتی ہے، وہ کوئی ملکہ نہیں ہے بلکہ روشنی ہے، وہ ذہانت یا مرضی نہیں ہے بلکہ ذہانت اور مرضی کی مالک ہے، جو ہماری ہستی کا دارومدار ہے وہ اسکی پشت پناہ ہے، یعنی وہ ایک غیر مقبوضہ کثرت ہے اور اس کثرت پر بھی نہیں کہا جا سکتا ہمارے اندر یا عقب سے ایک روشنی تمام چیزوں پر پڑتی ہے جس سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ہستی کی کوئی حقیقت نہیں ہے، جو کچھ ہے، یہ ہی روشنی ہے، انسان ایک مندر کا بیرونی حصہ ہے جسمیں تمام دانشمندی اور نیکی مرکوز رہتی ہے جسکو ہم عام طور پر انسان کہتے ہیں، وہ کھاتا ہے، پیتا ہے، بوتا ہے، گنتا ہے، ہمیں چونکہ معلوم ہے کہ وہ ان باتوں میں اپنی ذات کی نمایندگی کرتا ہے مگر غلط کرتا ہے، ہم انسان کی عزت نہیں کرتے بلکہ روح کی عزت کرتے ہیں جسکا انسان

مظہر ہے۔ اگر وہ اپنی روحانی خوبیوں کو اپنے افعال سے ظاہر کرے تو اس حالت میں وہ واجب التعظیم ہوگا۔ جب روح عقل کو مظہر بناتی ہے تو اسکو ہم فراست کہتے ہیں، جب روح قوت ارادی کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی ہے، تو وہ نیکی کہلاتی ہے، جب وہ محبت کے جذبہ کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے، تو محبت کہلاتی ہے، اگر عقل و خود مختاری اور قائم بالذات ہونے کی کوشش کرے تو اسوقت سے وہ محض بیکار شے ہے، اور مرضی کی کمزوری اسوقت سے شروع ہو جاتی ہے جب کوئی انسان خودی کا دعویٰ کرے، جب ہم کوئی اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو اس سے ہمارا یہ مقصد ہوتا ہے کہ روح کو کسی نہ کسی رنگ میں اپنے ذریعہ سے ظاہر کیا جائے، دوسرے الفاظ میں اسکا مطلب یہ ہے کہ روح ہم سے کوئی کام کرائے۔

(ترجمہ) محمد نجم الغنی قریشی

غزل

ذرہ ذرہ اس جہاں کا پیکر تصویر تھا
کسقدر حیرت فزا یہ عالم تقدیر تھا

خندہ زن بیچارگی پر عالم تقدیر تھا
ہائے وہ دیوانہ جو سر گشتہ تدبیر تھا

تھا عیاں ہر ہر نفس سے رنگ تخریب حیات
میری نادانی کہ میں وارفتہ تعمیر تھا

کچھ نہ سمجھا بے حسوں نے ورنہ عبرت کے لیئے
ہر نفس میرا کتاب عشق کی تفسیر تھا

زندگی کیا تھی مگر اک قید زندانِ خیال
حلقہ موج تخیل، حلقہ زنجیر تھا

کوئی سمجھا ہی نہیں عظمت کو اے رزمیؔ تری
ورنہ تو تو خواب ہائے قدس کی تعبیر تھا

"سعید رزمی"

مریخ کی دنیا

تاریک رات میں جب کائنات خاموش ہوتی ہے، اور آدمی خواب راحت میں مصروف، تب ماہر فلکیات اپنی دوربین اٹھاتا ہے، چپ چاپ ٹمٹمانے والے ستاروں پر اسکی بیتابانہ نظریں پڑتی ہیں، اور وہ ان نورانی اجرام کی حقیقت معلوم کرنے پر مصر ہوتا ہے جب اسے کوئی عجیب نقل و حرکت نظر آتی ہے، یا کوئی نیا ستارہ اسکی آنکھوں کے روبرو آتا ہے تو بہ کمال دلچسپی سے اسکی حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہے اس کے لیئے اس سے زیادہ لطف کسی بات میں نہیں ہے کہ اسے چپ چاپ اپنی رصدگاہ میں بیٹھنے دیا جائے گرد و پیش شور اور ہجوم نہ ہو اور بہ مجسمۂ سکوت اپنی دوربین کے ذریعہ آسمان کی کیفیتوں کا مطالعہ کر سکے،

بیشک دنیا والوں کو اس تنہائی پسند آدمی سے دلچسپی نہیں ہوگی، وہ تو اسکی رصدگاہ کو محض تفریح خانہ، اور اس کے مشاہدۂ سیارگان کو محض لہو و لعب تصور کرتے ہوں گے، مگر وہ بیخبر کیا جانیں کہ اس نے ان کی معلومات میں اضافہ کرنے کی غرض سے اپنی آسائش کو خیرباد کہا ہے! اسکی زندگی کا ایک متبرک مقصد ہے، اور صرف ایک ۰۰۰۰۰۰ جو لوگ ستاروں کی عظمت اور ان کے حالات سے بیخبر ہیں انہیں واقف کیا جائے، اور دنیا میں علم کا اضافہ ہو۔

۲۳۔ اگست ۱۹۲۴ء کو سیارہ مریخ ہم سے تین کروڑ چھیالیس لاکھ میل قریب آ گیا تھا، حالانکہ اس سے پہلے وہ بہت دور تھا، اور ۱۹۰۹ء میں وہ چھ کروڑ اسی لاکھ میل کے فاصلہ پر تھا! اگر ہیئت داں نہ ہوتا تو دنیا مریخ کے قریب ہونے سے اتنی ہی بےخبر رہتی جتنی پہلے تھی، لوگ مریخ کی طرف سے بھی اتنے ہی بے التفات ہوتے جتنے ستاروں کی محفل کی جانب سے ہیں، جسطرح روز ستارے ٹمٹماتے رہتے ہیں اور ان کی جانب کوئی متوجہ نہیں ہوتا، بعینہٖ اسی طرح مریخ کی نقل و حرکت اور اس کے حالات سے بھی دنیا بالکل ناواقف ہوتی۔

اگست میں تم نے دیکھا ہوگا کہ مغربی گوشہ میں ایک لال ستارہ ٹمٹماتا تھا، یہی مریخ ہے، ہیئت داں بہت عرصہ سے اس کے پر اسرار حالات معلوم کر رہے ہیں، یہ تو پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ مریخ ہماری زمین سے بالکل مشابہ ہے، اور وہاں جو آدمی آباد ہیں، وہ ہم سے جداگانہ قسم کے ہیں اسمیں سیاہ لکیروں کا مشاہدہ بھی کیا گیا تھا، جو نہریں ہیں، یہ نہریں یا تو پانی کی قلت کی وجہ سے کھودی گئی ہیں یا ایسی ہی ہیں، مریخ کی زندگی بہت کم رہ گئی ہے، اور وہ عنقریب چاند کی طرح مردہ سیارہ ہو جائیگا، اسکی آبادی بھی فنا ہو جائیگی،

وہاں بھی ہماری زمین کی مانند فصلی تغیرات ہوتے ہیں، نباتات وہاں بکثرت ہیں۔ اس کے شمالی اور جنوبی قطب

کی چوٹیاں بھی برف سے ڈھکی رہتی ہیں، مریخ کا قطر ۴۲۰۰ میل ہے اور وہ کرۂ ارض سے چھ حصہ کم ہے،

ہیئت دانوں نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ مریخ والے ہماری دنیا کے باشندوں سے نامہ وپیام کرنے کے لیئے بے قرار ہیں اور متعدد طریقوں سے گفتگو کرنی چاہتے ہیں، چنانچہ تین سال ہوئے جب مارکونی صاحب نے انکشاف کیا تھا کہ لاسلکی کے آلات میں خود بخود پیغام وصول ہوا کرتے ہیں، اور اغلب ہے کہ مریخ والوں کے پیام ہوں۔

امسال اگست میں مریخیوں کو متوجہ کرنے اور ان سے اشارہ بازی کرنے کے بیشمار امکان تھے، جب سے طاقتور دوربینیں ایجاد ہوئی ہیں، اور جب سے سائنس کا دور شروع ہوا، ایسے امکانات مہیا نہ ہو سکے، مریخ آفتاب کے عین مقابل تھا لہذا انعکاس کی وجہ سے اسکی پوری حالت معلوم کرنے کا امکان تھا، اور دنیا کی سب رصدگاہوں میں اس کا خاص اہتمام کیا گیا تھا، سوئٹزرلینڈ میں مریخ کے مشاہدہ کے لیئے خاص رصدگاہیں تیار کی گئی تھیں، نقشے جا بجا بنائے گئے، دوربینیں استادہ کی گئیں، نئے نئے آلات اور عکاسی کے کیمروں سے کام لیا گیا۔ الغرض انسان سے جو ہو سکتا ہے وہ کچھ بھی فروگذاشت نہیں کیا گیا، لیکن جو حالات اب تک معلوم ہو سکے وہ اس پیچیدہ سوال کا جواب دینے سے قاصر ہیں کہ مریخ میں کون سی قوم آباد ہے؟" پروفیسر امیلی شاسر کی جو خاص رصدگاہ سوئٹزرلینڈ میں قائم کی گئی تھی، اسکی رپورٹ کچھ دلچسپ ہے پروفیسر کا بیان ہے کہ انہیں مریخ میں روشنی نظر آتی ہے، ان کے بیان کے بموجب یہ روشنی ایسی تھی جیسے ٹمٹمانے والی شمع کی ہوتی ہے، بعض ہیئت دانوں کا خیال ہے کہ مریخ میں جو متصورہ روشنی نظر آئی وہ محض نظر کا دھوکہ ہے بہرکیف ماہر فلکیات اب تک کامیاب نہیں ہوتے ہیں کہ مریخ کی پوری حالت معلوم ہو، نہ مریخ والوں سے گفتگو ہو سکی ہے ایک سائینس داں نے اندازہ لگایا ہے کہ ایسی برقی روشنی کے ذریعہ سے اہل مریخ کو اپنی جانب متوجہ کیا جا سکتا ہے جو موجودہ لمپوں کی روشنی سے چالیس کروڑ حصہ زیادہ ہو، لیکن اتنی زبردست برقی لالٹین تیار کرنے کے لیئے ابھی آدمی کی عقل اور دماغ آمادہ نہیں، لیکن کوئی دن آنے والا ہے جب مریخیوں سے گفتگو ہو سکے گی، اور اس کے پورے حالات معلوم کیئے جائیں گے البتہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آیا وہ وہاں کے آباد کار ہم سے مشابہ ہیں یا نہیں۔

سب سے پہلے پروفیسر شیاپریلی نے مریخ میں سیاہ خطوط دریافت کیئے ہیں جو درحقیقت نہریں ہیں، پھر اطالیہ کے اس ہیئت داں کی تصدیق امریکن پروفیسر پرسیول لاول نے کی تھی، جب آدمی کسی چیز کو دیکھتا ہے تو اسکا مصرف وہی تجویز کرتا ہے جو اسکی عقل اور ذہن کے موافق ہو، مریخ میں نہریں کیوں ہیں، اب تک اس کا جواب بھی دیا جا سکتا تھا کہ مریخی کاشتکاروں کی کھیتیوں کو سرسبز اور شاداب رکھنے کے لیئے ان نہروں کو کھودا گیا ہوگا یا قدرتی ہونگی، دوسرا خیال یہ بھی ہے کہ باربرداری اور دوسرے کاموں کے لیئے نہروں میں کشتیاں اور جہاز چلتے ہوں گے اور مریخ کے باشندے

اپنی برقی کشتیوں میں بیٹھکر رواں دواں ہوتے ہوں گے، مگر یہ سب قیاسات ہیں۔

مریخ کی دنیا الگ ہے، اسلیئے ہماری زمین سے اس کے حالات کو مطابق کرنا درست نہیں ہے، تاوقتیکہ پورا حال نہ معلوم ہوجائے، دوسرے یہ کہ نہروں کے مصرف پر بحث کرتے وقت ہمیں فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ "زمین" کا ذکر ہم نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ ایسی نرالی دنیا سے ہمیں سابقہ پڑ رہا ہے جہاں کے حالات باوجود انسانی کوششوں کے ابتک قیاسات کے پردہ میں گم ہیں، امریکہ کے ایک سائنس داں نے حال میں مریخ کی دنیا پر بالکل عجیب قسم کی روشنی ڈالی ہے، اسکا خیال ہے کہ مریخ میں جو آبادی ہے اسے "زندہ نباتات" کہنا چاہیئے اگر وہاں کوئی جاندار ہوسکتے ہیں تو انہیں انسانوں درندوں، چوپایوں، یا حشرات سے مشابہ نہیں قرار دیا جائیگا، بلکہ خربوزہ، تربوز، ککڑی، لوکی، شلجم، چقندر، وغیرہ سے تشبیہہ دیجاوگی، یہ نباتی جاندار چلتے پھرتے ہیں اور اسی طرح کام کرتے ہیں جیسے ہم، انہی کے مصرف کے لیئے نہریں کھودی گئی ہیں، اسمیں شک نہیں کہ یہ خیال ندرت اور غرابت کا پہلو لیئے ہوئے، مگر حیاتیات کے محققین کے کلیہ کے بموجب اسکی تردید مشکل ہے۔

جن لوگوں نے فلسفۂ ارتقا کا مطالعہ کیا ہے، وہ واقف ہیں کہ طلسم حیات کا آغاز کیسے ہوا ہے، یہ کروڑوں برس پہلے کی بات ہے، اسوقت ہماری زمین بالکل غیر آباد تھی۔ مینہ اور آفتاب کی گرم پاشیوں سے محروم تھی وہ ایک ہولناک منظر ہوگا! نہ پرندوں کی نغمہ سرائی تھی، نہ آدم زاد کا نشان، پہاڑ اور میدان تھے اور کچھ نہیں تھا، اسوقت ایک نقطہ کی برابر شے سمندر میں نمودار ہوئی، یہ ایک قسم کا مادہ تھا، بتدریج ترقی کرتے کرتے یہ ذرہ دو حصوں میں منقسم ہوگیا۔ ایک نباتات کا حصہ ہوگیا اور ایک حیوانات کا حصہ۔

نباتی حصہ نے ساکن رہنا اور اوپر ہی اوپر بڑھنا سیکھا، ہوا، آفتاب، زمین، اور پانی سے اپنی غذا حاصل کرنی سیکھی اور حیوانی حصہ نے ادہر ادہر چلنا، حرکت کرنا، اور غذا تلاش کرنے کے لیئے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا سیکھا، نباتی حصہ آج تک اپنی اسی حالت پر قانع ہے جو لاکھوں برس پہلے تھی، لیکن حیوانی حصہ نے بہت کچھ ترقی کی ہے، شدہ شدہ ان کے منہ ناک، ہاتھ، پیر، اور جسمانی اعضا کا ارتقا ہوا، وہ کیڑوں کی طرح رینگنے لگے، پھر ان کا ایک حصہ نے تیرنا سیکھا جیسے جونک وغیرہ، پھر اور ترقی ہوئی اور ان کی ہیئت بدل گئی، اور زیادہ حسب تیرنے والے جاندار پیدا ہوئے جیسے مچھلی، لاکھوں برس تک یہی حالت رہی، ان تیرنے والے حیوانوں کی نقل و حرکت صرف سمندروں تک محدود تھی، اس اثنا میں چند مچھلیوں نے ساحل پر چلنا سیکھا، اور ان کے پیر بن گئے، جیسے کچھوا، مگر، یا کیکڑا، پھر ان کا ایک قبیلہ بالکل پانی کے باہر رہنے لگا، اور انڈوں کی بجائے سالم بچہ دینے لگا، مثلاً بلی وغیرہ، پھر کچھ پرواز کرنے لگے، اور ان کی بیشمار اقسام ہوگئیں چند لاکھ برس بعد وہ بندر بنے اور پھر انسان، قصہ مختصر یہ ہے کہ اپنی اپنی قابلیت کے بموجب سب کا ارتقا ہوا، جنمیں سے ارتقا کی قابلیت

سلب ہوگئی اور وہ وہیں ٹھہر گیا، آپ کسی عجائب خانہ میں جاکر دیکھیئے جہاں حیاتین کے نقطۂ نظر کے مطابق سب جاندار ون کے نمونے موجود ہوں، چھپکلی، گرگٹ، گوہ، سانڈا، نگرمچھ، گھڑیال، اور اس قسم کے بے شمار ذی روح اجسام کی مماثلت پر غور سے نظر ڈالیئے جس کی جتنی قابلیت تھی اتنی ہی اس نے ترقی کی، جیالوجی کے ماہرین نے مدت کی تحقیقات کے بعد یہ نتائج اخذ کیئے ہیں، بندر نے ایک درخت سے دوسرے درخت پر چالاکی سے اچھلنا کیوں سیکھا، اسلیئے کہ اسے غذا بہم پہونچانے میں آسانی ہو، گھوڑے کے قدم بالکل اچھٹتے ہوئے کیوں پڑتے ہیں؟ اس نے اپنی عادت اسی قسم کی بنائی ہے اور محض اس خیال سے یہ عادت ہوئی ہے، کہ جو سبزہ زار اسے مرغوب ہے وہ پامال نہ ہوسکے، انسان نے اپنی عقل اور ذہن کو اسلیئے ترقی دی ہے کہ وہ اور اسکی اولاد زیادہ سہولیت سے رزق اور غذا بہم پہونچاسکے۔ اب دو مختلف جماعتوں — نباتات اور حیوانات — میں تنازع للبقا شروع ہوا۔ ذی روح نباتات سے غذا حاصل کرتے ہیں اور نباتات براہ راست یا بالواسطہ حیوانات سے۔

یہ زمین کے طلسم حیات کا حال بیان کیا گیا ہے، لیکن اگر مریخ میں بھی حیات کی شروعات سمندر میں چند نقطوں کے نمودار ہونے سے ہوئی ہو تو، تصور نہیں کیا جاسکتا کہ ہماری زمین ہی کی مانند وہاں بھی ارتقا ہوا ہوگا، زمین پر ہوا اور پانی کی کبھی قلت نہیں رہی ہے جو حیوانات کے لیئے از بسکہ ضروری ہیں، اگر سیارۂ مریخ پر ہوا اور پانی کی بہت قلت ہے، اس سے بھی مستنبط ہوتا ہے کہ وہاں اگر ارتقائے حیات ظہور پذیر ہوا ہوگا تو ضرور ہمارے ارتقا سے متضاد ہوگا، پھر یہ نتیجہ کیوں نہ نکالا جائے کہ جب وہاں پانی بالکل قلیل، اور ہوا بہت رقیق اور بلکہ معدوم ہے تو وہاں کشمکش حیات غذا کے لیئے نہیں شروع ہوئی ہوگی، بلکہ ہوا اور پانی کے لیئے ضرور وہاں کے ذی روح ہوا اور پانی کے حصول کے لیئے جد و جہد کرتے ہوں گے، اور ان کی نشو و نما صرف نباتات کی صورت میں ہوئی ہوگی۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ نہریں نباتات نے کھودی ہونگی؟ اسکا جواب معقول دلائل کی بنا پر اثبات میں دیا جائیگا۔ ہماری دنیا میں جہاں نباتات کی نشو و نما و ارتقا کے لیئے ماحول بالکل حوصلہ شکن ہے، تاہم نباتات میں جان اور ان میں ذہانت "دریافت" ہوئی ہے، شرمائی کا پودا اتنا ذکی الحس ہوتا ہے کہ صرف چھونے سے مرجاتا ہے، پودوں پر رنج و غم کا اثر ہوتا ہے، بعض پودے تبدیلی موسم کا پتہ دیتے ہیں۔ سورج مکھی ہمیشہ آفتاب کی جانب رہتا ہے الغرض بے شمار امثلہ ملیں گی کہ نباتات میں ذہانت کا وجود ہے۔

لیکن برعکس اس کے سیارۂ مریخ میں نباتاتی نشو و ارتقا کے لیئے حالات بہت امید افزا ہیں، پھر نہروں کے متعلق یہ بھی خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ وہ نباتاتی آبادی کے خطوط ہوں، بہرحال یہ بعید از قیاس نہیں ہے کہ [illegible]

کی دنیا میں نباتات کا عمل دخل ہو اور جسطرح یہاں آدمی کی حکومت ہو وہاں کسی اعلیٰ قسم کے درخت کی حکومت ہو گی!

زمانہ سب سے بہتر معلم ہے، ہیئت دانوں کی سعی وجہد اور زمانے کی تبدیلی سے پتہ لگتا ہو کہ آدمی ایک نہ ایک دن مریخ کے پراسرار حالات معلوم کرے گا، خدا کرے اسکے فنا ہونے کے پہلے ہی اسرار کا انکشاف ہو جائے تاکہ ملحدین کو پورا یقین ہو جائے کہ خدا کی بادشاہت بہت بڑی ہے

حسن عزیز جرنلسٹ

فلسفۂ عشق

درد ہے الفت کی کمزوری کا نام
ہجر ہے اک خاص مجبوری کا نام

وصل اک خواہش ہے اور ناپائدار
دائمی رخصت ہے مہجوری کا نام

عاشقی تخریب کی دھن سے مراد
صبر ہے اس دھن کی مجبوری کا نام

چال ہے فتنہ، ادا ہے فتنہ زا
اور قیامت تیری رنجوری کا نام

قہر ہے رشک عدو لیکن جفا
خلق معشوقی کی کمزوری کا نام

صبر سمجھے ہے میری محرومی مراد
اور پردہ تیری مجبوری کا نام

نامرادی کامیابی کی دلیل
کامیابی ہجر کی دوری کا نام

تم تو دل میں ہو، نہیں دل سے جدا
ہجر ہے اس عارضی دوری کا نام

ترک الفت کی ہوس افسوس کیوں
اب نہ لینا ہم سے معذوری کا نام

افسوس ٹونکی

کلامِ آتش

خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی جیسے زبردست شاعر اور مسلم الثبوت استادِ فن سے کون واقف نہیں، دنیائے شاعری اور ادب اردو میں آپ کا نام نامی آفتاب سے زیادہ روشن اور مہرِ عالم تاب سے بڑھ کر منور ہے، ایک ایسی یگانۂ روزگار ہستی اور کامل ترین فن کے کلام معجز نظام پر ریویو یا تنقید تو درکنار تقریظ بھی مجھ جیسے کم مایۂ علم کا کام نہیں، بہرصورت مجھے جس تحریک نے اس مضمون کے لکھنے پر مجبور کیا وہ محض جوشِ عقیدت اور اپنے جذبۂ تحسین کی تسکین دہی ہے، قبل اس کے کہ میں خواجہ صاحب کی شاعری پر رائے زنی کروں، اس امر کا اظہار بے محل اور غیر ضروری نہ ہوگا کہ جس زمانہ میں اُن کی شاعری کی نشو و نما ہوئی اور جس عہد میں بحیثیت ایک شاعر کے انہوں نے میدانِ سخن میں قدم رکھا، وہ ایک ایسا عہد تھا جبکہ اردو شاعری بلحاظ وسعتِ مضامین اور جدتِ تخیل کمسن تھی، اسکی جامہ زیبی کے واسطے صرف فارسی لٹریچر ہی کا لباس تھا، اور کلام پارس ہی اُس کا اتالیق، جو کچھ اسنے سکھایا وہی سبق اسکی زبان پر تھا، سوسائٹی کا مذاق سخن، محض گل و بلبل کی افسانہ خوانی اور خیالی وصل و ہجر کی قصہ گوئی تک محدود تھا، شعرا کی طبع آزمائی کے لیے خاص خاص مضمون اور عنوان قائم تھے، بڑے بڑے شعرا انہیں مخصوص مقامات میں توسنِ فکر کی جولانی دکھاتے تھے اُس پر طرہ یہ کہ قدم قدم پر صنائع اور بدائع شوکتِ الفاظی اور رعایت لفظی کی بھرمار تھی، غیر مانوس تشبیہات اور دور از خیال استعارات کی ٹھونس ٹھانس۔

بلند پروازی اور مضمون آفرینی کی سربفلک عمارات ملکِ سخن میں اٹھائی جاتی تھیں اور کذب و تعلی کے مینار قائم کیے جاتے تھے شعرائے باکمال انہیں فرسودہ خیالات اور پامال مضامین کو اپنے ذہنِ رسا اور جودتِ طبع سے الٹ پھیر کر اُس وقت کے رنگ کے مطابق فکرِ رسا کے سانچے میں مختلف شکلوں اور پہلوؤں سے ڈھالنا اپنے اوپر واجب جانتے تھے تخیل کا حصہ بہت تھا، اور واقعات و جذبات نگاری کم ہی نہیں، بلکہ قریب قریب معدوم تھی نہ باستثنائے دو چار فطرت شناس شعرا کے کسی کو اس جانب توجہ تھی، ملک میں بھی یہی شاعری مقبولِ خاص و عام تھی اور دربار اودھ میں بھی اسی کو شرف باریابی و عزت نمود حاصل تھی، ہر شخص اس کا والہ و شیدا اور بڑے بڑے فضلا اسپر عاشق و مفتوں، ان حالات کی موجودگی میں ناممکن تھا کہ ہمارے فطرت شناس خواجہ صاحب سوسائٹی کے اثر سے محفوظ رہتے اور عمارتِ سخن سب سے جدا اٹھاتے بالخصوص جبکہ وہ اپنے ہمعصروں اور ہمنواؤں کو ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا دیکھتے تھے اور وہی محبوبِ طبائع

تو ان کے لیئے محال تھا کہ وہ اُس سے بچ سکتے ہیں اس امر واقعہ سے انکار نہیں ہو سکتا کہ کشش تقلید نے انہیں بھی اپنی طرف کھینچا اور ان کے خمخانۂ شاعری میں بھی شراب کہن موجود ہے۔ آتشکدۂ آتش میں خیالی حسن و عشق کی دبی ہوئی صرف چنگاریاں ہی نہیں۔ بلکہ تعلّی اور غلو کے حقیقت سوز شعلے بھی کہیں کہیں بھڑک رہے ہیں۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی ان کے خرمن سخن میں کس جنس کی افراط ہے۔ ان کے کان نظم میں کس قسم کے جواہرات زیادہ ہیں، انکی بحر طبیعت کے نکلے ہوئے وہ کونسے موتی ہیں جنکو انہوں نے خوبی و خوش اسلوبی سے سلک نظم میں پرو دیا ہے، اور جنکی آب و تاب چمک دمک سچائی اور لاجوابی کے مقابلہ میں دوسرے موتی کم قیمت اور بے وقعت ہیں، کن مضامین کے باندھنے میں انہیں کامیابی ہوئی ہے اور کیا چیز انکی شاعری کو طغرائے امتیاز اور تمغۂ فضیلت بخشتی ہے، ان خیالات کو پیش نظر رکھکر جب ہم ان کے وسیع چمنستان ادب کی سیر بہ نظر غور کرتے ہیں تو ہمیں دو چار نہیں بیسیوں روشیں اور سیکڑوں تختے ایسے دکھائی دیتے ہیں جنمیں پاکیزہ خیالات، عالی جذبات، لطافت زبان فصاحت بیان حقیقت نگاری اور صداقت نویسی کے سدا بہار خوشنما رنگ برنگ پھول کھلے ہوئے ہیں جنکی خوبصورتی و دلفریبی چشم بصیرت میں نور قلب مضطرب میں سکون، طبیعت کو فرحت روح کو تازگی و راحت پہونچاتی اور جنکی مہک و خوشبو دماغوں کو معطر اور دلوں کو پر کیف بنا دیتی ہے۔ اور واجب الاحترام باغبان کی محنت و تلاش نزاکت طبع نفاست فکر کی داد شکر گزار زبان سے بے ساختہ نکل جاتی ہے۔

شاعری کیا ہے در حقیقت مصوری ہے بلکہ اس کا مرتبہ مصوری سے بالاتر ہے کیونکہ مصور صرف ظاہری اشیاء و حالت کا نقشہ اتارتا ہے، اور تمام جذبات دلی اور احساسات روحانی کو ایسا نمایاں نہیں کر سکتا جیسا کہ ایک حقیقی شاعر جو اپنے معنی یاب طبیعت اور قادر الکلامی کے زور سے ہر واقعہ اور جذبہ کی پوری تصویر الفاظ میں کھینچ دیتا ہے اور شعر کو سنکر سامع پر وہی اثر طاری ہوتا ہے جو ناظر پر، ہر ایک منظر کی تصویر کھینچنے اور انسان کے فطری جذبات و احساسات کا مرقع پیش کرنے کے لیئے این رشد کے الفاظ میں اسکی ضرورت ہے کہ شعر ایسا کہا جائے جسے سامع سنکر بول اٹھے، کہ ایسا تو میں بھی کہہ سکتا ہوں، مگر جب کہنے بیٹھے تو عاجز و ناکام رہے، اس کا یہ مطلب ہے کہ ہر ایک واقعہ اور حالت کا پورا پورا نقشہ ایسے سادہ عام فہم سلیس مناسب الفاظ میں اُتارے جو اُس کے لیئے مخصوص و موزوں ہوں، اور اس ترتیب و تہذیب سے کہ تصنع کا شائبہ تک نہو اور یہی اصل معنی میں حقیقی شاعری ہے، خواجہ صاحب کے رنگ سخن کی پیروی اُنکے لائق اور مشہور تلامذہ نے بھی ایک حد تک کی۔ چنانچہ صبا و رند کے کلام میں بالتخصیص استاد کے رنگ کی جھلک ہے۔

خواجہ صاحب کے کلام میں مندرجہ بالا خصوصیات ہیں، اُن کا پُر زور قلم صفحۂ قرطاس پر ایسی نقاشی دکھاتا ہے جس کے خط و خال نقش و نگار صحیفۂ دل پر نقش کالحجر ہو جاتے ہیں۔

ان کا سارا کلام صاف اور سلجھا ہوا، زبان کوثر وتسنیم سے دھلی ہوئی مضامین آسمان سے اترے ہوئے، سادگی ہے تو غضب کی، شوخی ہے تو قیامت کی، بندش الفاظ ہے کہ نگینے جڑے ہوئے ہیں، گرم بیانی ہو کہ آتش افروزی، ہر مصرعہ واقعہ کا مرقع ہر شعر درد کی تصویر۔ ہر ایک منظر سے ایک تجربہ حاصل کرنا، ہر ایک واقعہ سے ایک بہتر نتیجہ نکالنا ہر ایک مشاہدہ سے ایک روحانی کیفیت پالینا، انکی تلاش فکر کا شغل خاص اور کرشمۂ دوربینی تھا، انکی حقیقت نگر نگاہ ہمیشہ مطالعہ فطرت کیا کرتی تھی، اور اُن کا اصلی رنگ جذبات نویسی تھا، یہی وجہ ہے کہ علاوہ صحیح جذبات و احساسات وحسن وعشق کے معرفت وحقیقت نفس کشی و رضا جوئی۔ قناعت و توکل، خاکساری و فقر غیرت و خودداری، ہمدردی ومحبت، سلوک و احسان، ہمت واستقلال وغیرہ وغیرہ ایسے ایسے وسیع و اعلیٰ مضامین پند ونصائح سے اُن کا کلام مالا مال ہے، جن کے مطالب و معانی کے تفصیلی محاسن وخوبیوں کی شرح اگر کی جائے تو بلاشبہ ایک مستقل کتاب علم تصوف و اخلاق کی تالیف ہو سکتی ہے، ان بسیط نیچرل مضامین کو دیکھکر ماننا پڑتا ہے۔ کہ موصوف صرف زبردست شاعر ہی نہیں بلکہ درویش منش صوفی بھی تھے۔

سلاست بیان۔ جذبات عالیہ اور جدت تخییل انکی شمشیر سخن کے نمایاں اور آبدار جوہر ہیں۔ سوز وگداز اُن کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے وہ خود ایک جگہ فرماتے ہیں اور بجا فرماتے ہیں۔

لکھے ہیں سرگزشت دل کے مضموں یکقلم میں نے
تماشہ قتل گہ کا ہے مطالعہ میرے دیواں کا

ماہر فن مصور نے اپنے آئینہ کلام کو تمثیلات اور تشبیہات کی بہترین صناعی سے کبھی جلا دی ہے لیکن وہ استعارات وتشبیہات نہایت پاکیزہ اور شگفتہ ہیں، اور ہر کانوں نے سنا اور ہر دل نے سند قبولیت عطا کی، نہ مغلق الفاظ ہیں، نہ پیچیدہ مضامین، انکی خصوصیات کلام میں ایک خاص صفت یہ بھی ہے کہ وہ اکثر و بیشتر صائب کے مانند ایک مصرعہ میں کوئی دعویٰ کرتے ہیں اور دوسرے میں تائید وثبوت دعوے کے لیئے زبردست اور کافی دلیل پیش کر دیتے ہیں، جس سے شعر میں برقی طاقت اور اسکے اثر میں مقناطیسی قوت پیدا ہو جاتی ہے اُن کے تمام کلام پر نگاہ تعمق ڈالنے اور اسکا موازنہ ومقابلہ دیگر اساتذہ لکھنؤ کے کلام سے کرنے پر ایک بے تعصب دل اور انصاف پسند طبیعت کو اس کے تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہیں ہو سکتا کہ شعراء سے دہلی کے بعد شعراء لکھنؤ میں صرف ایک خواجہ صاحب ہی ایسے شاعر ہیں جنہوں نے غزل میں جذبات نویسی کی بنیاد رکھی جو باعتبار اپنی خصوصیات کلام اپنے ہموطن اور ہمعصر شعراء لکھنؤ سے جداگانہ ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

ممدوح کے تمام نیچرل کلام کا حصہ بہت زیادہ ہے اور اُس کا انتخاب کارے دارد۔ تاہم ناظرین کی دلچسپی کے لیے کچھ اشعار منتخب کرکے پیش کرتا ہوں، ہر شعر اپنی ظاہری اور باطنی صفات کی شرح و تفصیل چاہتا ہے، مگر اندیشہ ہے کہ مضمون طویل ہو جائیگا۔ اسلیئے انکی خوبیوں سے لذت یابی، ناظرین کے ذوق سلیم پر چھوڑتا ہوں، اہل دل پڑھیں اور وجد میں آئیں، آخر میں اعتراف ہے کہ حضرت آتش کی شاعری میں جسقدر محاسن ہیں ان کی پوری پوری ثنا گوئی اس مختصر مضمون میں نہ ہوسکی، افسوس کہ موصوف کا پورا اور صحیح دیوان نہیں ملتا بازاروں میں جو دیوان مطبوعہ نولکشور پریس ملتا ہے وہ نہایت بوسیدہ اور جابجا غلطیوں سے بھرا ہوا ہے۔

رنگ تغزل

خدا اسر دے تو سودا دے تری زلف پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

فریب حسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا
خدا کی یاد بھولا شیخ بت سے برہمن بگڑا

تری تقلید سے کبک دری نے ٹھوکریں کھائیں
چلا جب جانور انساں کی چال اسکا چلن بگڑا

لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجیے دہن بگڑا

آنکھیں دکھائیں تو نے دیوانے ہو گئے ہم
یہ وہ فسوں نہ تھا جو اپنا اثر نہ کرتا

محبت میں مزہ ملتا ہے ایذائیں اٹھانے سے
اُسی کو ہم نے چاہا جو حسیں بیداد گر دیکھا

اللہ جانتا ہے اسے خوب کیا کہوں
میرا سوال اُس بت بے پیر کا جواب

شوق ہے دل میں تو آنکھوں میں تصور اُسکا
منزلیں جلوۂ محبوب کی آباد ہیں سب

ہمنشیں کہتے ہیں افسانہ سے آجاتی ہے نیند
ہجر کی شب میں سنونگا داستان کوئے دوست

قاصدوں کے پاؤں توڑے بدگمانی نے مری
خط دیا لیکن نہ بتلایا نشان کوئے دوست

تصوف

جس طرف دیکھیے آتا ہے نظر وہ محبوب
جلوۂ یار سے ہے عالم امکاں آباد

جسم خاکی سے ہے دشوار رسائی تجھ تک
گرد اُڑکر نہیں چھو سکتی ہے داماں تیرا

نظارہ صورت سے معنے کا خیال آیا
لیلے کے ہوئے مجنوں ہم دیکھ کے محمل کو

کعبہ و دیر میں وہ خانہ برانداز کہاں
گردش کا نرودیدار لیئے پھرتی ہے

نشست بر دیوار حیرت ہیں ہزاروں صورتیں
صاحب آئینہ خانہ آج تک روپوش ہے

سیر دردوں سے کہنہ حقیقت کھلی مجھے
باہر نہیں کتاب کا مطلب کتاب سے

تعلیم اخلاق و عمل

عہد پیری میں تو کر یاد الٰہی غافل
رات تو کٹ گئی غفلت میں نہ کھو فرصت صبح

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ
قناعت بھی بہار بے خزاں ہے

گدا و شاہ برابر ہے خاک کے نیچے
لحد میں ساتھ یہ قصر بلند بام نہیں

سختی ایام ہے میرے لیئے سامان عیش
خشت بالیں کو سمجھتا ہوں میں زانو حور کا

سر کاٹ کے کر دیجیئے قاتل کے حوالے
ہمت مری کہتی ہے کہ احسان بلا سے

کسی پر مجھ سے دنیا میں ستم دیکھا نہیں جاتا
بجائے شمع کاٹیں اہل محفل میری گردن کو

نہ جب تک ہم پیالہ ہو کوئی مے نہیں پیتا
نہیں مہماں تو فاقہ ہے خلیل اللہ کے گھر میں

نیک طینت کو بدی کا نہیں منظور عوض
انتقام اپنا نہ یوسف نے لیا اخوان سے

شریف فکری

غزل

جستجوئے دید قلب آرزو مسکن میں ہے
مضطرب اک برق گویا میرے جان و تن میں ہے

اے خود آرا ناز ہی کیا اپنا اپنا ہی نصیب
فرق ایسا کیا مری جیب اور ترے دامن میں ہے

پھر تصور کر رہا ہے سلسلہ جنبانیاں
پھر وہ طوق حلقہ گیسو مری گردن میں ہے

کل گریباں جسکو کہتے تھے جنوں کے ہاتھ سے
بڑھتے بڑھتے آج بس اک چاک سا دامن میں ہے

دیکھنا حامد ذرا محفل طرازی حسن کی
ہر شریک بزم گویا وادی ایمن میں ہے

ایڈیٹر

"اعانت مجرمانہ"

عابد ایک نیک طینت نوجوان تھا، بچپن سے اسے بائیسکوپ دیکھنے کا بے انتہا شوق تھا اور ڈیٹیکٹیو ڈرامے دیکھ دیکھ کر اسکی طبیعت میں خاصا سراغرسانی کا مادہ پیدا ہو گیا تھا، چونکہ وہ خود ایک ذہین اور چالاک نوجوان تھا اسلئے ہر معاملہ کو وہ گہری نظر سے دیکھتا تھا، اس کا وقت بہت بُرا صرف ہوتا تھا، یا تو وہ گھر پر ناول دیکھا کرتا تھا، یا سینما دیکھنے چلا جاتا تھا، ان دو چیزوں کے علاوہ اسکو دلچسپی ہوتی تو کسی اہم اور پیچیدہ معاملہ سے اگر کہیں قتل ہوتا تو یہ سب سے پہلے پہونچ جاتا اور ایک پرائیویٹ سراغرساں کی طرح دریافت شروع کر دیتا، وہ مختلف اخباروں کا نامہ نگار بھی تھا اسلیئے پولیس بھی اس سے خار ملا رکھتی تھی، اسکو اپنی تفتیش کے دوران میں کبھی یہ خیال پیدا نہ ہوتا تھا کہ وہ پولیس سے جداگانہ راستہ پر گامزن ہے، وہ کبھی یہ احساس بھی نہ کرتا تھا کہ اگر وہ اپنی تفتیش میں کامیاب ہو بھی گیا، تو اس کے لیئے فائدہ مند نہ ہوگا، وہ صرف اپنی دھن میں کام کیئے جاتا تھا، اسکا دوست انسپکٹر ماجد .... سی آئی ڈی انسپکٹر تھا، جو ایک تجربہ کار شخص ہونے کے علاوہ اپنی عمر کا بہترین حصہ سی آئی ڈی میں گزار چکا تھا، عابد اکثر اپنی تحقیقات کے دوران میں ماجد سے مدد لیا کرتا تھا، ماجد کو جب کبھی کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہوتی وہ عابد سے کہہ دیتا، عابد نہایت ہی خوشی سے کام کو شروع کرتا اور اپنی ڈائری ماجد کو دیدیتا، انسپکٹر ماجد کو چونکہ عابد سے اس قسم کی محبت ہو گئی تھی اور وہ اسکی بہتری کا خواہشمند رہتا تھا اسلیئے اسنے عابد کو مجبور کیا کہ وہ سی آئی ڈی آفس میں کام شروع کر دے جسے عابد نے بڑی بخوشی قبول کیا، دوسرے ہی دن انسپکٹر نے عابد کو ڈائرکٹر جنرل کے پاس پیش کر دیا، اور اسکی کارگذاریاں نمایاں کیں، چونکہ عابد شہر کے شریف گھرانوں سے تعلق رکھتا تھا اور وہاں کی سوسائٹی میں جا، آ سکتا تھا اور امراؤ و عمائدین شہر کے خانگی حالات سے کما حقہ واقف تھا اسلیئے ڈائرکٹر جنرل نے بھی ایسے شخص کی ضرورت محسوس کی اور اسکی خدمات ایک سب انسپکٹر کی حیثیت سے قبول کی گئیں۔ چونکہ عابد کسی اور انسپکٹر کے ساتھ کام کرنا نہ چاہتا تھا اسلیئے انسپکٹر ماجد کے ساتھ کر دیا گیا۔

بے ضابطہ سراغرساں نے چند دن کی تعلیم میں خاصی مہارت پیدا کر لی اب اسکو صورت تبدیل کرتے، چال ڈھال لب ولہجہ بدلتے دیر نہ لگتی تھی، اب اسکو معمولی سرقہ کی واردات میں مزا نہ ملتا تھا، وہ ہمیشہ بہت ہیبت ناک اور پُر خوف جرائم کی تلاش میں رہتا تھا، سراغرسانی کوئی معمولی فن نہ تھا مگر طبیعت کی مناسبت اور پھر غیر معمولی محنت میں ایک سال کے عرصہ میں عابد کو سراغرسان کا لقب ضرور مل گیا تھا۔ دوستی اتحاد اور پھر یک جائی نے ماجد کے خلوص کو

اور بھی زیادہ کر دیا تھا، اب وہ بالکل گہرے دوست بنے ہوئے تھے، آپسمیں بہت ہی بے تکلفی بڑھ گئی تھی۔ قدیم دوستی کو جدید یکجہتی نے اور بھی مستحکم کر دیا تھا،

(۲)

انسپکٹر ماجد ایک پینتیس سالہ تجربہ کار سیہ فام بلند و بالا جوان تھا، یونی فارم میں (جسے وہ شاید ہی پہنتا) بہت بڑا معلوم ہوتا تھا مگر معمولی لباس اسے چنداں بدنما ظاہر نہ کرتا تھا، اسکی شادی کوئی دس برس قبل ہو چکی تھی، دو لڑکیاں چھ اور سات سالہ عمر کی تھیں۔ اس نے کبھی کسی کے حسن کی تعریف نہ کی تھی قدرت نے اسے حسن پسند دماغ ہی نہ دیا تھا، اگر کسی مقدمہ میں کسی حسین عورت سے چند دن خلا ملا پیدا کرنے کی ضرورت پڑتی تو وہ قبل از قبل عابد سے اسکا اظہار کر دیتا۔ بلکہ اپنی بلا اسی کے سر پر ڈال دیتا تھا، گو وہ عابد سے دوستانہ اور برادرانہ سلوک کرتا تھا مگر تاہم بھی بعض باتیں ایسی تھیں جنکا عابد کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا، گو وہ عابد کو شریک کار سمجھتا تھا، مگر اسے رازدار نہ بناتا تھا، اسکے گھر کی ایک بات بھی عابد سے پوشیدہ نہ تھی مگر اسکے دلی منشار سے عابد ہرگز با خبر نہ تھا، عموماً دونوں ملکر یا جداگانہ طور پر اپنا اپنا کام ختم کر لیتے، گو ہر ایک دن بھر مارا مارا پھرتا مگر بعد مغرب کسی وقت دونوں ایک جگہ ہو جاتے اور اپنی اپنی ڈائری مرتب کر لیتے، شاید ہی کبھی ایسا اتفاق ہوا ہو کہ عابد اور ماجد کسی خاص کام کے لیئے رات کو ملکر نکلتے ہوں، البتہ اگر کوئی مشاعرہ یا مجلس ہوتی تو ماجد عابد کو ضرور بلا لیتا۔

اکتوبر ۱۹۱۸ء کی اندھیری رات میں عابد بستر پر پڑا کروٹیں بدل رہا تھا کہ اسے سیٹی کی آواز سنائی دی دونوں سراغرساں آپسمیں ایک دوسرے کو بلانے کے لیئے ایک خاص سیٹی جو بالکل باریک آواز تھی استعمال کرتے تھے، عابد نے دو دفعہ سیٹی کی آواز سنی اور سرہانے سے کنجیوں کی زنجیر نکال کر جسمیں سیٹی بھی تھی، جواب میں سیٹی بجائی اور خود گھر کے باہر نکل آیا۔

انسپکٹر...... سیاہ فراک کوٹ اور سیاہ ایرانی ٹوپی پہنے ہوئے ہاتھ میں ہنٹر لیئے سائیکل کو دیوار سے لگا کر کھڑا ہوا تھا، اسکے قبل کہ عابد کسی قسم کا سوال کرے انسپکٹر نے کہا "کپڑے پہن لو" عابد نے پوچھا کیا سائیکل پر چلنا ہوگا" جسکے جواب میں انسپکٹر نے صرف سر ہلا دیا، پانچ منٹ کے بعد عابد ایک ہاتھ سے سائیکل سنبھالے دوسرے ہاتھ سے شیروانی کی بٹن لگاتے ہوئے نکلا، بغیر کچھ کہے سنے" دونوں سائیکل پر سوار ہو گئے" دس منٹ تک اندھیری گلیوں میں سے گذرنے کے بعد دونوں شاہ راہ پر پہونچے، برقی روشنی نے آنکھیں چوندھیا دیں، اور گھڑیال نے دس بجائے، اوہ دس بجگیئے، انسپکٹر نے تعجب سے کہا، مگر عابد نے کوئی جواب نہ دیا، انسپکٹر نے پھر کہا

وقت گزر رہا ہے اور کام بہت ہیں، عابد نے پوچھا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیا ضروری کام ہے، پھر جیب سے پان کا بیڑا نکال کر کھانے لگا اور لونگ پھینکتے ہوئے کہا، کیا کوئی ضروری ہدایت ملی ہے؟ انسپکٹر نے سنجیدگی سے عابد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، نہیں، خانگی کام ہے۔ عابد نے قہقہہ لگا کر کہا شاید کسی مشاعرے میں جانا ہوگا، انسپکٹر نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ وہ ایک تنگ گلی میں مڑ گیا جسکے پیچھے عابد بھی چلا، تھوڑی دور چلکر دونوں سائیکل سے اتر پڑے اور ایک مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔

(۳)

انسپکٹر نے بڑی ہی احتیاط سے چاروں طرف دیکھ کر کہا، عابد! تم میرے لیئے کچھ کر سکتے ہو، عابد نے متحیر ہو کر کہا ہاں تمھارے لیئے سب کچھ کر سکتا ہوں بشرطیکہ میرے امکان میں ہو، انسپکٹر نے کہا تم کو اعانت مجرمانہ کرنی ہوگی، عابد نے ہنسکر کہا، میں اقدام قتل کے لیئے بھی تیار ہوں، ماجد نے عابد کا سیدھا ہاتھ تھام لیا اور محبت سے کہنے لگا اچھا تیار ہو جاؤ، میری ہدایات تمھارے لیئے کافی ہوں گی، تم اپنی سائیکل کہیں چھوڑ دو اور ایک بند بگھی کہیں سے لاؤ، باقی کام پھر بتلایا جائیگا، عابد نے بلا کسی جواب کے سائیکل سنبھالی اور سیدھا چوک کی طرف چلا گیا، بندہ علی کے کارخانے میں اسنے اپنی سائیکل چھوڑ دی، اور وہاں سے ایک بگھی لیکر نکلا، جسکو وہ خود چلا رہا تھا اور کوئی سائیس یا کوچوان نہ تھا، انسپکٹر ماجد منتظر کھڑا تھا، وہ اپنی سائیکل لیکر بگھی کے آگے ہو گیا، کامل آدھے گھنٹہ تک دونوں چلنے کے بعد ایک نکڑ پر جا پہونچے، انسپکٹر نے کہا اسی راستے واپس ہونا پڑیگا، کہکر سائیکل آگے بڑھائی اور عابد نے گاڑی پلٹا کر کھڑی کر دی اور خود اتر کر راستہ کی دونوں طرف دیکھنے لگا، عابد جسوقت بگھی پر سے اتر رہا تھا، ایک نوجوان شخص عالت نشہ میں کچھ مغلظات بکتا ہوا سامنے سے گذرا اور آگے بڑھ کر ایک مکان کی کنڈی کھٹکھٹانے لگا، دو منٹ کے بعد دروازہ کھلا اور وہ شخص اندر چلا گیا مگر ایک نوجوان سانولی عورت عابد کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔ جسے دیکھکر عابد نے منہ پھیر لیا، بارہ بجے ایک لانبا سیاہ پوش شخص جسکی گھنی داڑھی اور لانبی لانبی مونچھیں چڑھی ہوئی تھیں بگھی کے پاس سائیکل رکھ کر عابد کو ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے واپس ہو گیا یہ سائیکل فولڈنگ تھی جو دونوں د ۔۔۔۔ اسکو کھولنے سے آپسمیں مل کر دونو ایم متوازی ہو جاتے تھے، عابد نے اسیطرح سائیکل کو موڑ کر بگھی میں رکھا اور خود مسکراتا ہوا سگریٹ سلگانے لگا، ٹھیک اسوقت جبکہ عابد سگریٹ روشن کر رہا تھا ایک باریک سیٹی کی آواز سنائی دی جسکو سنکر عابد نے اپنے دونوں ہاتھ اسکی مدد کے لیئے بڑھا دیئے اور سیاہ پوش نے نیچے اتر کر آواز دی جس کے جواب میں ایک سرخ پوٹلی اوپر سے گر پڑی جسے عابد نے اٹھا لیا، اور پھر ایک سرخ برقعہ پوش عورت اسی کوٹھے کی چھت پر سے اترنے

لگی، جسے عابد اور ماجد نے اتارا اور تینوں مل کر تیزی کے ساتھ بگھی کی طرف چلے۔ ماجد نے عورت کو بگھی میں سوار کرا دیا اور خود بھی عابد کے کان میں کچھ کہکر اپنی ڈاڑھی اتار کر عابد کو دیدی اور دراصل وہ داڑھی والا سیاہ پوش ماجد تھا، عابد نے جیب سے مونچھیں نکال کر نہایت ہی صفائی سے اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں پر چڑھا لیں اور اسی لانبی داڑھی کے دونوں تاروں کو کانوں پر عینک کی کاڑیوں کی چڑھا کر بگھی کی دونوں قندیلیں روشن کیں اور خود کوچ بکس پر بیٹھ کر گاڑی چلانے لگا اب گاڑی چلانے والا عابد نہ تھا بلکہ ایک متوسط اندام گورا سیاہ داڑھی والا بوڑھا تھا، جو نہایت ہی اطمینان کے ساتھ بڑے ہی مشاق کی طرح گاڑی چلا رہا تھا۔

دو گھنٹے تک بگھی مختلف راستوں پر پھرنے کے بعد ٹھیک تین بجے کاروان پہونچی اور ایک غیر پختہ سفالی مکان کے سامنے کھڑی ہوگئی، مکان کا دروازہ کھلا اور ماجد عورت کو لیکر داخل ہوگیا عابد نے گاڑی سے سائیکل اتار کر دیدی اور خود اسی ہیئت کذائی سے بگھی پلٹا کر واپس ہوگیا۔

(۴)

دوسرے دن دس بجے دن کے عابد مکان سے نکل ہی رہا تھا کہ انسپکٹر آ پہونچا دونوں میں بڑے ہی تپاک سے ملاقات ہوئی، عابد نے پوچھا اب تو بڑا ہی ہنگامہ ہوگا، "ذرا وہاں کی خبر بھی لینی چاہیئے" ماجد نے کہا وہاں پنچنامہ ہو رہا ہے تم بھی ہو آؤ تو مناسب ہے۔ اسی قدر گفتگو کے بعد دونوں ملکر سائیکل پر سوار ہوگئے، راستہ خاموشی سے کٹا، جس راستہ سے کہ کل بگھی گئی تھی اسی راستہ سے عابد مڑ گیا اور ماجد نے "میں گھر پر رہونگا" کہکر سائیکل آگے بڑھائی، عابد اس مکان پر سے جس پر سے کہ رات ماجد اور ایک عورت اترتے تھے گذرتے ہوئے آگے بڑھ گیا، اسی مکان کی پشت پر ایک بڑے پھاٹک کے اندر چند آدمی کھڑے ہوئے تھے اور ایک صدر امین بلا ڈریس بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا، سامنے ایک معمر بزرگ گدے دار آرام کرسی پر حقہ پیتے ہوئے متمکن تھے جن کے پیچھے چند خدمتگار دست بستہ کھڑے ہوئے تھے عابد نے پھاٹک میں داخل ہوکر سائیکل ایک طرف رکھدی اور صدر نشین بزرگ کو جھک کر سلام کیا، صدر امین نے اسے دیکھتے ہی کہا، عابد آؤ تم کو تو اس مقدمہ سے دلچسپی ہونی چاہیئے ذرا پیچیدہ مقدمہ ہے، عابد صدر امین کے بازو کرسی کھینچکر بیٹھ گیا ایک محرر بعض لوگوں کے بیانات قلمبند کر رہا تھا، صدر امین نے ان بزرگ سے یہ کہکر عابد کا تعارف کرایا کہ "آپ خفیہ پولیس کے ایک ہوشیار انسپکٹر ہیں" ان بزرگ نے مسکرا کر سر ہلا دیا اور عابد کی طرف خاصدان اور حقہ بڑھایا جسے عابد نے سلام کرکے لے لیا، عابد نے لکھے ہوئے بیانات کو مسکراتے ہوئے دیکھا اور جو بیانات قلم بند کیے جا رہے تھے انہیں غور سے سنتا رہا، جسقدر بیانات کہ لیے گئے تھے بالکل غیر ضروری اور مقدمہ سے سراسر خلاف تھے،

ہنوز بیانات لکھے جا رہے تھے کہ ایک نوجوان سانولی صورت صدر امین کے سامنے کھڑی ہوگئی اور کہنے لگی سرکار میرا بیان پہلے لکھ لیجئے، عابد نے کسی قدر گردن ٹیڑھی کرکے دزدیدہ نظر سے اس عورت کی طرف دیکھا یہ وہ عورت تھی جو رات کو دروازہ میں سے جھانک رہی تھی، عابد نے منہ پھیر لیا چونکہ وہ عابد کی پشت کی طرف تھی اسلیئے عابد کو نہ دیکھ سکی صدر امین کے پوچھنے پر اس عورت نے اپنا نام حسن بی بتلایا اور حسب ذیل بیان لکھوانے لگی۔

دو سرکار میں کل رات کو بھائی کے انتظار میں تھی میرا بھائی ساڑھے گیارہ بجے رات کو شراب پیئے ہوئے آکر دروازہ پر دستک دینے لگا، میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک بگھی نظر آئی جس کے قریب ہی ایک گورا سا نوجوان جو سیاہ کشتی نما ٹوپی اور زرد رنگ کی شیروانی پہنے ہوئے تھا نظر آیا جس نے مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیا، میں دروازہ بند کرکے سوراخ میں سے جھانکنے لگی، وہی گورا جوان سگریٹ پیتا ہوا ٹہل رہا تھا، تھوڑی دیر کے بعد ایک لانبا آدمی کالی شیروانی کالی ٹوپی پہنے ہوئے سائیکل لیکر آیا جسکی داڑھی بڑی اور مونچھیں لانبی لانبی تھیں، اسنے جوان کو سائیکل دی اور خود واپس چلا گیا، گورے جوان آدمی نے سائیکل کے دو ٹکڑے کرکے اندر رکھ دیئے اور پھر ٹہلنے لگا۔ اس کے بعد مسماۃ حسین بی نے سیٹی کی آواز آنے اور عابد کے آگے جانے کا حال بیان کرکے کہا کہ اسکے آگے بڑھتے ہی میں دروازہ کھول کر پیچھے ہوگئی اور پھر دونوں کا ملکر عورت کو اتارنا اور سیاہ پوش داڑھی والے کا اترنا بیان کرکے کہنے لگی، کہ جسوقت یہ لوگ واپس ہونے لگے، میں دوڑتی ہوئی گھر میں داخل ہوگئی، اور پھر دروازے کے سوراخ سے دیکھنے لگی اتنا کہکر اسنے بعد کی تمام کیفیت بیان کی اور کہنے لگی، کہ گورا جوان داڑھی اور لانبی مونچھ لگا کر بوڑھا بن گیا مگر کالی شیروانی والے کی پیٹھ میری طرف تھی جسے میں داڑھی لگا تے کے بعد دیکھ نہ سکی، اور وہ اسیطرح بگھی کے اندر چلا گیا، پھر گاڑی آگے بڑھ کر دار الشفاء کی طرف چلی، صدر امین کے پوچھنے پر اسنے عابد کا پورا حلیہ بیان کیا اور کہنے لگی میں اس کا چہرہ اچھی طرح دیکھ چکی ہوں اسکی سونے کی لال نگ والی انگوٹھی اور ہاتھ کی سونے کی چمکتی ہوئی گھڑی جسوقت دیکھو نگی پہچان لونگی۔ عابد تمام بیان کو بیٹھا ہوا سن رہا تھا، اسنے حسین بی کی طرف رخ نہ کیا وہ صدر امین کے چہرے کو اور لکھے جاتے ہوئے بیان کو گھور رہا تھا جو محرر لکھ رہا تھا، جسوقت سوالات کرتے کرتے صدر امین تھک گیا اور حسین بی تڑاق پڑاق جوابات دیتی رہی تو مجبور ہوکر محرر نے کہا کہ اچھا آؤ اپنے بیان پر نشان انگشت کردو۔ اب حسین بی محرر کی طرف بڑھی جو عابد کے سامنے ہی بیٹھا ہوا تھا، حسین بی کا آگے بڑھنا تھا کہ عابد کا چہرہ زرد ہوگیا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا، اب حسین بی بالکل اسکے مقابل میں پہونچ چکی تھی، اسنے عابد کو گھور کر دیکھا قریب تھا کہ اسکی منہ سے چیخ نکل جائے، مگر عابد نے مسکراتے ہوئے اپنی بڑی بڑی کالی آنکھیں حسین بی سے ملائیں اور کچھ اسطرح سے اسنے سر کو جنبش دی کہ حسین بی کے چہرے سے حیرت و استعجاب جاکر ایک

سرخی چھا گئی اور اس نے شرما کر آنکھیں نیچی کر لیں، آگے بڑھ کر اپنے بیان پر انگوٹھے کا نشان کیا اور پھر ساکت کھڑی ہو گئی، عابد نے بلا کسی سوال و جواب کے صدر امین سے کہا تم بیانات مکمل کر لو، علیہ پورا لکھ لو، میں شام کو ملونگا اور پھر صدر نشین بزرگ کو جھک کر سلام کیا اور آگے بڑھ کر حسین بی کی طرف ایک دلربایانہ انداز سے دیکھتا ہوا پلٹ گیا، سامنے ایک پولیس کا کانسٹیبل کھڑا ہوا تھا، جسنے سلام کیا اور عابد نے اسے ایک پر معنی نظر سے دیکھتے ہوئے سائیکل اٹھائی اور پھر سیدھا عابد کے گھر کی طرف چلا گیا۔

(۵)

انسپکٹر بیٹھا ہوا نہایت ہی بےچینی سے انتظار کر رہا تھا، عابد نے تفصیلی حالات کہے۔ عابد ابھی حسین بی کا بیان کہہ رہا تھا کہ وہی کانسٹیبل جسنے عابد کو سلام کیا تھا آپہونچا، جو اپنی معمولی سیاہ ڈریس میں تھا۔

کانسٹیبل۔ حسین بی آپ کو دریافت کر رہی تھی، میں اس سے کہہ آیا ہوں کہ آپ رات کو اس کے پاس آئینگے۔

عابد۔ کہیں اسنے اپنے بیان کی تفصیل تو نہیں کی۔

کانسٹیبل۔ جی نہیں وہ صدر امین صاحب کے پاس سے ہٹ گئی تو میں نے آپ کا پیام پہونچا دیا بڑی ذہین عورت ہے آپکے نام اور پتہ پوچھ رہی تھی میں نے آپ کا نام احمد علی اور پتہ بھی غلط بتایا ہی، عابد نے مسکراتے ہوئے جیب سے ڈائری نکالی اور کچھ لکھنے لگا۔ اسنے مختلف رنگوں کی سیاہیوں سے بارہ ورق سیاہ کر دیئے اور پھر ڈائری انسپکٹر کی طرف پھینک کر کہنے لگا یہ تلمی کیڑے ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے ہیں۔

اس واقعہ کی اطلاع جب اسپرنٹنڈنٹ کو پہونچی تو یہ مقدمہ انسپکٹر ماجد کے سپرد کیا گیا مگر عابد نے خود کو اس مقدمہ سے علیحدہ کر کے ایک اور مقدمہ اپنے لیئے انتخاب کر لیا، یہ بہا موقعہ تھا جو عابد انسپکٹر ماجد سے علیحدہ کام کر رہا تھا دوسرے دن رات کے نو بجے عابد حسین بی کے مکان پر پہونچ گیا۔ حسین بی ایک آوارہ مزاج شوقین عورت تھی اس کا ایک بھائی بھی ایسا ہی آوارہ اور شرابی تھا وہ تمام دن اپنی نوکری پر رہتا اور رات کو شراب پی کر واپس آتا مگر حالت نشہ میں اسقدر خراب رہتی تھی کہ وہ گھر آتے ہی کھانا کھا کر سو جاتا اور اسے دنیا کی خیر خبر نہ رہتی اور نہ یہ معلوم ہوتا کہ اسکی بیس سالہ بہن کیا کر رہی ہے۔

حسین بی نے عابد کا خیر مقدم بڑے ہی تپاک سے کیا اور گھر میں لیجا کر بٹھایا اسکا مکان معمولی سفالی مکان تھا جسمیں صرف ایک دالان اور دو کمرے تھے، اور مختصر سا صحن۔ عابد کو وہ حجرے میں بٹھا کر خود سامنے بیٹھ گئی اور پان بنانے لگی، مگر عابد نے اسے پان بنانے سے روک دیا، اور کہنے لگا میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں مجھے وقت

بہت کم ہے کیا تم میری بات سنو گی؟ حسین بی نے انداز سے سر ہلا دیا۔ عابد نے کہا، کل جو شخص گھی کے پاس کھڑا تھا اسے تم پہچانتی ہو، حسین بی نے کہا ہاں ضرور پہچانتی ہوں اسکی بڑی بڑی آنکھیں گورا گورا رنگ میں نہ بھولوں گی، اور سچ یہ ہے کہ رات آپ بہت ہی حسین معلوم ہو رہے تھے، اگر آپ کل اپنی کالی کالی آنکھوں سے دیکھ کر مجھے مجبور نہ کر دیتے تو میں ضرور آپ کو بتلا دیتی۔ عابد نے مسکرا کر کہا، ابھی بتلا دو۔ حسین بی نے عابد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کہا نہیں، میری زبان ہے نہیں۔ مجھے معلوم نہیں آپ نے کیا کر دیا، عابد نے اسکو اپنی طرف کھینچا اور اسکے پتلے ہونٹ مسلتے ہوئے کہنے لگا، اچھا تم قسم کھاؤ کہ اس راز کی حفاظت کرو گی، حسین بی نے اپنی باہیں عابد کے گلے میں ڈالدیں، اور کہنے لگی درگاہ کی قسم میں کسی سے ایک لفظ نہ کہونگی پھر اسنے کہا کہ آخر تم بلقیس کو کسطرح اڑا لے گئے۔ عابد نے سنجیدگی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ نہیں مجھے اس سے کچھ تعلق نہیں وہ بجائے میری بہن کے ہے میرے ایک دوست سے اس سے محبت تھی جو کل اسے لے گیا، البتہ میں نے اسکی مدد کی ہے حسین بی نے کہا وہی کالے کپڑے پہنے ہوئے لمبی داڑھی والا، عابد نے سر ہلا دیا، دیر تک دونوں میں اختلاط ہوتا رہا اور اسی کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔

(۶)

عابد ایک پاکباز نوجوان تھا جو اپنا دامن کسی فعل شنیع سے ناپاک کرنا نہ چاہتا تھا۔ حسین بی اسکے برخلاف ایک بازاری اور شوقین عورت تھی اسنے عابد کو اپنے رنگ پر لانے کی بہت کوشش کی مگر ایک بھی پیش نہ گئی آخر ایک روز تنگ آکر وہ عابد کو برا بھلا کہنے لگی، اور عابد نے بھی اسکو صاف جواب دیدیا کہ وہ اسکی نفسانی خواہشات پوری نہیں کر سکتا۔

مقدمہ کو چھ مہینے ہو گئے نہ تو بلدہ پولیس ہی کچھ پتہ لگا سکی اور نہ اضلاع پولیس، اضلاع پولیس نے تو خود مجرم کے ہاتھ مقدمہ دیا تھا بھلا وہ کیا سرسبز ہوتا۔ پولیس نے بھی مجبور ہو کر ہاتھ اٹھا لیا تھا۔

حسین بی نے صرف ایک امید پر اس راز کی حفاظت کی تھی، اب اس نے نا امید ہو کر بلقیس کے والدین اور صدر امین سے صاف صاف کہدیا کہ وہ عابد ہی تھا جس کا حلیہ وہ لکھوا چکی تھی اور واقعہ بھی یہ تھا کہ حلیہ بالکل عابد کا تھا۔ کوتوال صاحب بلدہ نے عابد کو بلوا کر دریافت کیا مگر اسنے اپنی ڈائری پیش کر دی کہ وہ وقوع واردات کی رات میں سکندر آباد میں تھا۔ حسین بی کے بیان کی نسبت اسنے بیان کیا کہ وہ شاید کسی جگہ سے دیکھ چکی ہے اور اپنے بیان کی تصدیق کے لیئے اس کا نام ظاہر کرتی ہے۔ حالانکہ حسین جس روز حلیہ لکھوا رہی تھی عابد سامنے ہی بیٹھا تھا، اگر ایسا ہوتا تو وہ یقیناً اسی روز بتلا دیتی۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ ایک انسپکٹر کا بیان ایک عورت کے مقابلہ میں جب کہ واقعات خود اسکی تکذیب کر رہے ہوں صحیح سمجھا جائے، اسلیئے حسین بی کے بیان پر کوئی لحاظ نہیں کیا گیا۔ اس ناکامی پر حسین بی کی

آتش غضب اور بھڑک اٹھی وہ تو عابد کی دشمن ہی ہوگئی تھی اب اسنے بلقیس کا پتہ لگانا شروع کر دیا، وہ عابد کی زبان سے یہ سن چکی تھی کہ بلقیس شہر میں نہیں ہے مگر اسے یقین کب آتا اسکو یہ تو یقین ہوچکا تھا، کہ بلقیس کو عابد نے ہی فرار کرایا اور بلقیس اسی کے پاس ہے، حسین بی نے تمام شہر چھان ڈالا وہ چاہتی تھی کہ بلقیس کا پتہ لگائے اور عابد کو بدنام کرنے میں کامیاب ہو اگر اس کا بس چلتا تو عابد کو زندہ بھی رہنے نہ دیتی اب اسنے امکانی کوشش شروع کردی تھی ہر محلہ میں بلقیس کو ڈھونڈھتی پھرتی اور عابد جہاں جہاں جاتا تھا وہ بھی ان مکانات میں پہونچکر بلقیس کو ڈھونڈھتی، غالبًا عابد کو اسکی دشمنی کی خبر تھی مگر وہ اس سے بالکل بے فکر تھا کہ وہ بلقیس کا پتہ لگانے لگی۔

حسین بی کو کسی کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ عابد اکثر محلہ کاروان میں جاتا ہے حسین بی نے ایک عورت کو کاروان میں مقرر کردیا کہ عابد کس مکان میں جاتا ہے۔ پتہ چلائے، جب اسکو مکان معلوم ہوگیا تو وہ خود کاروان کو جانے لگی اور انسپکٹر کی بوڑھی ماما سے ملاقات پیدا کرلی، اور ایک دفعہ اسنے ماجد کو بھی مکان میں جاتے ہوئے دیکھا تھا ماجد کے قد وقامت کو دیکھکر اسکو اس واقعہ کی رات والا سیاہ پوش یاد آگیا اور اسنے ایک مرتبہ دروازہ سے جھانک کر بلقیس کو بھی دیکھ لیا، عابد کاروان کو کبھی کبھی آتا تھا گو بلقیس اسکے سامنے ہوتی ہے مگر وہ اس سے بہت کم گفتگو کیا کرتا تھا، کبھی وہ آتا بھی تو صرف انسپکٹر سے ملکر چلا جاتا تھا۔

(۷)

حسین بی کے بیان پر صدر امین نے کوتوال صاحب سے اجازت لیکر بلقیس کے والدین کو اطلاع دی اور بلقیس کاروان میں گرفتار کرکے والدین کے گھر لائی گئی، دریافت پر اسنے صاف بیان کردیا کہ انسپکٹر ماجد نے مجھے فرار ہونے کیلئے نہیں کہا اور میں اپنی خوشی کے ساتھ گئی ہوں، ماجد نے باضابطہ نکاح کیا ہے اور میں اس سے خوش ہوں۔ پولیس نے بلقیس کا بیان لیکر ڈائرکٹر جنرل کے پاس بھیج دیا اور ماجد فرائض منصبی کے ترک کرنے اور گورنمنٹ کو دہوکا دینے کی علت میں خدمت سے علیحدہ کردیا گیا۔ اور اسکی جگہ عابد سب انسپکٹر کو ترقی دی گئی۔

ادہر پولیس نے مقدمہ کا چالان عدالت میں کردیا ماجد پر کئی ایک دفعات لگائی گئیں۔

ماجد ایک بالکل بے پرواہ شخص تھا اسنے ملازمت کے جانے کی پرواہ بھی نہ کی اور نہ مقدمہ سے اسے پریشانی ہوئی بلقیس نے عدالت سے استدعا کی کہ وہ اپنے والدین کے پاس رہنا نہیں چاہتی اور وہ اپنے شوہر کے پاس رہے گی، اگر عدالت نے اجازت نہ دی اسلئے اسکو مجبورًا فیصلہ تک علیحدہ مکان میں رہنا پڑا، مگر وہ اپنے والدین کے پاس نہیں رہی۔

شہر میں زور کا پلیگ تھا روزانہ دو دو سو کیس ہو رہے تھے، ادہر ماجد کا مقدمہ بڑی شد و مد سے چل رہا ہے دونوں فریقین نے ایک ایک بیرسٹر مقرر کیا تھا دونوں خدا کے فضل سے مالدار تھے ۔

اتوار کی صبح کو ماجد کی پیشی تھی اتفاقاً ہفتہ کے دن ماجد کو شدت کا بخار آیا اور اتوار کی صبح اسکے دو گلٹیاں نمودار ہوئیں اور اس حال میں ہی عدالت جانا چاہتا تھا مگر عابد نے اسے روک دیا ۔

عدالت نے کامل آدھ گھنٹہ کے بعد فیصلہ سنا دیا کہ بلقیس اپنی خوشی سے گئی ہے اور وہ بالغ ہے اسکا نکاح بھی ہو چکا ہے اسی حالت میں وہ ماجد کی زوجہ ہے اس کے والدین کی استدعا پر لحاظ نہیں کیا جا سکتا ۔

ساڑھے پانچ بجے عابد پسینہ پسینہ ہو گیا ۔ دور سے کامیابی کا مژدہ سنانے لگا ماجد کی گلٹیوں کا آپریشن کر دیا گیا تھا اور اسکی حالت کسی قدر اچھی تھی ۔ اسی دن بلقیس بھی عدالت کی اجازت سے اپنے شوہر کے گھر آ رہی تھی مگر دونوں کا ملنا غضب ہو گیا ، بلقیس ماجد کو دیکھتے ہی رونے لگی اور اسقدر روئی کہ اسے بخار آ گیا ، ماجد کا بھی بخار بڑھ گیا ۔ دوسرے دن ماجد بالکل بیہوش ہو گیا اور بلقیس کے بھی گلٹیاں نکل گئیں ۔

ماجد کو دن کے گیارہ بجے ہوش آیا اس نے دیکھا کہ اس کے سرہانے اسکی پہلی بیوی بیٹھی ہے، اور دونوں طرف بچے ۔ عابد اسکے بائیں بازو پر بیٹھا ہوا ہے ۔ اور بلقیس اسکے قریب ہی پڑی ہوئی کراہ رہی ہے ، انسپکٹر ماجد اٹھ کر بیٹھ گیا ، اور بلقیس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ، پیاری بلقیس یہ میرے آخری لمحے ہیں اگر تم اس نامراد مرض سے بچ جاؤ ، تو میرا رنج نہ کرنا ۔ پھر وہ عابد کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا ، عابد تم نے میری ہمدردی کی خدا تم کو جزائے خیر دے دیکھو میں اپنی ملازمت کے زمانہ میں ایک کامیاب انسپکٹر رہا ۔ مگر ایک عورت نے مجھے اور تم کو شکست فاش دی ، یہ صرف ہماری غلطی ہے تم اگر کامیاب سراغرساں بننا چاہتے ہو تو اس کا خیال رکھو کہ پہلے اپنے اختیارات اپنے مخالفین پر صرف کرنا چاہیئے " پھر ماجد نے اپنی دونوں بچوں کو پیار کیا اور پہلی بیوی کا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھکر آنکھیں بند کر لیں ۔ اور تھوڑی دیر کے بعد سرد تھا ۔ ماجد کی حالت دیکھکر بلقیس بیہوش ہو گئی اور وہ تمام دن اور تمام رات بیہوش رہی ، دوسرے دن صبح کو اسنے بھی داعی اجل کو لبیک کہا ۔

جسوقت بلقیس قبر میں اتاری جا رہی تھی اور عابد اسکے سرہانے تھا وہ بلقیس کے بھائی سے مخاطب ہوا اسکی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے کہنے لگا " میں نے بلقیس کو فرار ہونے میں مدد دی نکاح میں مدد دی مقدمہ میں کام کر رہا ، اور اب قبر میں اتار رہا ہوں مجھے معلوم نہ تھا کہ اس اعانت مجرمانہ میں مجھے اتنے کام کرنے پڑینگے ۔

تمکین الکاظمی

گلبرگہ دکن

لقمان

حضرت لقمانؑ حضرت عیسیٰؑ سے چھ سو تیس برس قبل یونان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدین ایک معزز مگر متوسط الحال خاندان کے رکن تھے، آپ گو حسین نہیں تھے لیکن سیرت کی بیشمار خوبیوں کے مالک تھے اور [illegible] میں آپ کو حضرت داؤد علیہ السلام سے شرف تلمذ تھا،

آپ معرفت حقہ سے بہرہ اندوز نبوت اور رموز حکمت سے مالامال تھے، اور کیوں نہ ہوتے کہ ولقد آتینا لقمان الحکمۃ کے مطابق حکمت الٰہی کی تربیت یافتہ تھے، آپ کے پند و نصائح کا شمار مشکل ہے، جو بجائے خود حکمت و موعظت کا مجموعہ ہیں۔ آپنے دولت حکومت پر حکمت اور ریاضت کو ترجیح دی۔ سلطنت ملتی تھی مگر [illegible] سے اسکو حاصل نہیں کیا اور ٹھکرا دیا۔

آپ کی پیدائش کے واقعات غریبہ سے ایک خواب قابل ذکر ہے، جو درحقیقت ایک قسم کی بشارت ہے۔
پیدائش سے قبل آپکی والدہ نے عالم رویا میں اپنا تمام گھر پر نور دیکھا، اور گھر کی نورانیت سے [illegible] ہو گئیں اور اسی حالت میں نورانی لباس میں انفاس مقدس شرف افزائے ورود ہوئے، اور تسلیم و تکریم کے بعد ارشاد کیا کہ ہم [illegible] فرشتے ہیں اور خدائے عزوجل کے حکم سے آپ کو ایک خوش نصیب فرزند کی بشارت دینے آئے ہیں جب وہ پیدا ہو تو اسکا نام لقمان رکھنا،

یہ بچہ نبی ہوگا۔ تمام دنیا اسکی فضیلت کی معترف ہوگی، اسکا علم و حکمت خاندان میں چار چاند لگا دیگا اور زمانہ اسکی حکمت سے مستفید ہوگا، چنانچہ جب آپ پیدا ہوئے تو لقمان نام رکھا گیا۔

والدین کی عسرت سے تحصیل علم کا موقعہ اوائل عمر میں نہیں ملا، لیکن سات برس کی عمر میں خود ہی اکتساب ہنر شروع کر دیا، پندرہ بیس سال کی عمر تک موم بتی کا کام کرتے رہے اسکے بعد اپنے چچا کے ساتھ سنگتراشی اختیار کی۔ اور آبائی پیشہ کے لحاظ سے خاص دلچسپی و مہارت حاصل کر لی، ایک مرتبہ آپ کسی بڑے پتھر کی تراش اور اسکی فطری ساخت کو دیکھ کر قدرت الٰہی پر غور کرنے لگے کہ مجھ ایسا نحیف الشان بھاری بھاری پتھروں اور چٹانوں کو زیر و زبر کر دیتا ہے۔

ایک دن مربع کاری میں پتھر پر آپ کے ہاتھ سے اتفاقاً ضرب زیادہ پڑ گئی اور پتھر ٹوٹ گیا چچا نے اس نقصان اور غلطی کی بنا پر غصہ میں سخت سرزنش کی اور مارا۔ چونکہ قصداً آپ نے یہ غلطی نہیں کی تھی اور غیور طبع واقع ہوئے تھے، چچا کی

اسی بختی سے آبدیدہ ہوکر گھر چلے آئے۔ اور اپنی والدہ سے درد مند لہجہ میں من وعن اپنی سہودسزا کا واقعہ بیان کر دیا، والدہ یہ سنکر بے انتہا متاثر ہوئیں اور رونے لگیں، اور آپ بھی والدہ کی تکلیف اور اذیت کو دیکھکر اظہار واقعہ پر پشیمان ہوئے اور اسی رنج وافسوس میں آنکھیں بند ہوگئیں اور سو گئے۔

خواب میں دو عورتیں آئیں، ایک کریہہ المنظر نفرت انگیز بدوضع اور ہیبت ناک تھی اور دوسری عورت اسکے برعکس خوش پوش خوش وضع خوبصورت تھی اسکے گیسوئے مشکیں کی نکہت بیزیاں قلب کے لیئے مایۂ تقویت تھیں، آپ کا قول ہے کہ یہ دونو عورتیں مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے لگیں، جسقدر میں اُن سے دور ہوتا تھا، وہ میری طرف بڑھتی تھیں، اور مجھے مسخر کرنے کی کوشش کرتی تھیں، اور ایک دوسرے پر سبقت کرنا چاہتی تھیں، انکی اس کشمکش نے مجھے سخت آشفتہ خاطر بنا دیا اور انہوں نے بھی تھک کر فیصلہ کیا کہ لقمان جسکو پسند کرے وہی اسکی ہو جائے،

اس فیصلہ کے بعد کریہہ المنظر عورت نے کہا کہ لقمان تم مجھے جانتے ہو میں وہی سنگتراش ہوں جس سے ابھی ابھی آپ کو تعلق خاطر رہا ہے، اور آپ کے چچا کی شہرت کا باعث بھی میں ہی ہوں۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ میری گزشتہ خدمت گزاری اس تصفیہ کے وقت ملحوظ رکھی جائے میری یہ التجا بھی قابل پذیرائی ہے، کہ میرے اس فقیرانہ لباس اور درویشانہ صورت میں تصنع نہیں ہے۔ میں منکسر اور متواضع ہوں۔ گو اپنی نسبت کچھ کہنا خود ستائی ہے، مگر واقعہ کا اظہار اسلئے ضروری سمجھتی ہوں کہ میری مقابل حسینہ وجمیلہ ہے، اُسکی زلفوں کے جال میں آپ کا طائر دل نہ پھنس جائے، اُس کی میٹھی میٹھی باتیں شہد، شکر ہی نہیں بلکہ فریب اور دھوکہ کا زہریلا ساغر ہیں۔ میں نے دوستانہ طریقہ پر آپ سے کہدیا اب آپ کی عقل ودانش کا امتحان ہے، کبھی اسکی صورت پر نہ جانا۔ سیرت پر غور کیجیئے، اُسکی خوش پوشاکی اور ظاہری صفائی پر فریفتگی سراسر خسارہ اور نقصان کی صورت ہے، کیوں آپ فی ڈیاس سنگتراش کو بھی جانتے ہیں اُسکی صنعت عجیب وغریب ہے شاہی محل اُسی کے دستکاری کے نمونہ ہیں۔ اسیطرح پولی سلیکس مشہور کاریگر نے اپنی لاجواب دستکاری اور صنعت کی بدولت ملک سے خراج تحسین حاصل کیا اور دولت وعزت پائی اُسکی ذہانت اس درجہ تھی کہ بادشاہ اُس کے مشورہ کے متمنی رہتے تھے۔ آج اُسکے بہت سے بتوں کی پرستش ہورہی ہے، یہ اُسکی دستکاری ہے کہ جس پتھر کو اُس نے زینت دی وہ مسجود ہوگیا، میں اپنے مونس کو دولت دیتی ہوں، نامور کرتی ہوں، محبوب خلائق بناتی ہوں، آپ براہ انصاف میری بدصورتی سے قطع نظر کرکے، میری صفات پر غور کیجیئے، اور مجھے اپنا رفیق زندگی بنانے سے آپ کا خاندان دولت مند ہو جائیگا، آپ کی ماں باپ عیش وعشرت سے بسر کرینگے مجھے یقین ہے کہ میری حالت وصفات پر غور کرکے تصفیہ فرماوینگے، میں آپ کے لیئے کسدرجہ موزوں اور مناسب حال ہوں۔

لقمان علیہ السلام کے دل کو اس تقریر کے اثر نے ایک حد تک مسخر کر لیا تھا، مگر ظاہری صورت کی نفرت گفتگو کا اثر زائل کر لی جاتی تھی اس پس و پیش میں تھے کہ حسینہ نے کہا۔

میری مقابل بہن کمالِ ترانی تو آپ سُن ہی چکے، دو باتیں میری بھی سُن لیجئے، وہ جو ابھی ایک ایک کر رہی تھی ایک سنگتراش ہے، یا وہ گو ہے، سراسر عیب ہے، اُس کے ساتھ نسبت ہیں صرف سنگتراشی آپ کے حصہ میں آئیگی۔ میں مملکت علم و دولت کی مسند نشین ہوں، اس کے ساتھ آپ کی معاشرت بالکل غیر موزوں ہے۔ بہرحال اُس کے ساتھ ذلت میرے ساتھ عزت، اُس کے ساتھ کلفت، میرے ساتھ مسرت، حاصل ہوگی۔

سنئے، سنگتراشی کوئی بہترین علم نہیں ہے، جس پر اُسے ناز ہے، کیا آپ نے دیکھا نہیں ہے، کہ ایسی دھوپ جس میں چیل انڈا چھوڑے، ایسی سردی جس میں پرندہ گھونسلے سے باہر نہ آئے، ایسی برسات جس میں ندی نالوں میں مچھلیاں غائب ہوں، یہ سب موسم سنگتراش کے سر پر گزرتے ہیں، اور کسب معاش کی فکر ان مصیبتوں میں اس غریب کو مبتلا رکھتی ہے یہ ذلت و خواری کی باتیں نہیں ہیں تو کیا ہیں، ؟ اگر کسی بادشاہ نے کام اچھا دیکھ کر تحسین و آفرین کی تو اس سے اُس کی اضافی صفات پر کیا اچھا اثر پڑا۔ رہا تو وہی سنگتراش، بادشاہ تو نہیں ہوگیا، اگر صرف اس فن میں آپ اس میری بہن کی اعانت و امداد سے کامل بھی ہوگئے، تو کیا یہ امر ممکن نہیں ہے، کہ اس فن میں کوئی آپ سے بہتر بھی مل سکیگا، فضلنا بعضکم علیٰ بعض۔ جن لوگوں کو یہ دعویٰ ہے کہ میں اس فن میں سب سے اچھا ہوں غلط ہے، پھول پتے بیل بوٹے آپ اچھے بنانے لگے تو لوگوں کی تعریف و توصیف سوائے آپکی نفس پروری کے پتھروں میں کیا فائدہ دے سکتی ہے۔

آپ نے مجھے کبھی پہچانا کہ میں کون ہوں؟ اور میری صفات کیا ہیں۔ سنئے "میں علم ہوں" خدا کا سچا جلال، خدا کے اوصاف ذات کو عالم ظہور میں لانا، میرا فرض ہے، جس قوم نے مجھے حاصل کیا، اسکو خدا کے قرب سے نوازا، ایسی برکتیں حاصل ہوئیں کہ فرشتے اُس پر رشک کرنے لگے، شاہوں کی شاہی کی میں نمود ہوں، دانشمند میری تلاش میں سرگرم اور اہل فراست میری جستجو میں رہتے ہیں۔ دنیا کی بنیاد۔ دین کا استوار ستون میں ہی ہوں۔ علما، فضلا میرے محتاج ہیں۔

مدبران مملکت کو میری ضرورت ہے میں اپنے طالب کو مایۂ ناز بنا دیتی ہوں، وہ کونسی قوم ہے جس نے میری تالیف و تانیس کی بدولت شوکت، عظمت، حشمت، ثروت، نہ پائی ہو۔ میرے فیض و ایثار کی دولت عام ہے، میری نافرمانی بادشاہوں کے زوال کا سبب ہے، میری اطاعت عروج و برکات کا باعث ہے، میری اوصاف میں ہزاروں کتابیں موجود ہیں، ذی حس بچہ یا جوان، ادھیڑ ہو یا بوڑھا، امیر ہو یا فقیر، بادشاہ ہو یا گدا، سب میرا ہی دم بھرتے ہیں، میں اپنی تقریر کا خاتمہ اس مصرعہ

کرتی ہوں آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را۔ حضرت اب فرمائیے کیا نیت ہے، آپ میری امداد کے طالب تھے یا اس کافر کلموہی کی باتوں پر فریفتہ ہیں، میں نے جو کہنا تھا کہدیا، بر رسولاں بلاغ باشد و بس، اب آپ خواہ اس کے ہو جائیں یا میرے۔ میں نے شرط تبلیغ پوری کر دی۔

نہ قاضیم نہ مدرس نہ محتسب نہ فقیہ — مرا چہ سود کہ منع شراب خوارہ کنم

ہاں! اتنی بات اور سن لیجیئے، وہی سقراط جسکو آپ خوب جانتے ہیں، میری رقیب سنگتراش کے دام میں پھنسکر گمنام زندگی بسر کر رہا تھا، جب میرے حسن و جمال کا پرتو اسپر پڑا تو آنکھیں کھل گئیں۔ بدل و جان اُسنے مجھے حاصل کیا اور اب اسکی شہرت عالمگیر ہو رہی، اسکے اقوال پسندیدہ خاص و عام ہیں، اقوال کلیہ اور رموز بالغہ اُسنے عوام کے سامنے پیش کیئے، اور اسکی جو شہرت اور عزت ہوئی وہ محتاج بیان نہیں، آپ دیکھ رہے ہیں کہ میری رقیب کے ہاتھ میں ایک لوہے کا ٹکڑا ہے یہ قلم ہے، اس سے پتھر پر پھول بیل بوٹے وغیرہ نکالے جاتے ہیں، اور یہی آلہ شہرت سنگتراشی ہے ایک سنگتراش اسی سے گھنٹوں پتھر کے ٹکڑے کو تراشتا ہے۔ جب کسی قدر کامیاب ہوتا ہے، اُس بیچارہ کو جیب کسب معاش ہی دشوار ہے تو ہم چشموں میں اسکو عزت و شوکت کسطرح حاصل ہو سکتی ہے۔

حسینہ خاتون کی گفتگو پر میں مفتوں ہو گیا، اور بے تحاشا دوڑ کر اسکے قدموں سے لپٹ گیا میں نے اپنے چچا کی سختی کو یاد کر کے اس خاتون کو اسکا نعم البدل شمار کیا، اور استعانت چاہی۔

گو سنگتراش عورت میری یہ گرم جوشی دیکھکر ضبط نہ کر سکی، اُس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا، پیچ و تاب کھا کر ایک بت کی صورت ہو گئی۔

حسینہ خاتون علم کی نیکی نے مجھے اُسکے شر اور غضب سے بچا لیا، اور مجھے لیکر ایسی اڑی کہ اطراف عالم کی سیر کرا دی، عالم امکان کے جو مشاہدات اسوقت ہوئے وہ میرے وہم و خیال میں بھی نہ تھے۔ عجائبات مخلوق میری نظر سے گذرے، مرحبا مرحبا کی صدائیں میرے کان میں آئیں۔

اس تفریح کے بعد وہ خاتون مجھے میرے گھر لے آئی، میری جستجو میں میرے ماں باپ جو پریشان تھے مجھے دیکھکر خوش ہو گئے۔ پھر اُس خاتون نے بادب میرے ماں باپ سے کہا کہ آپکے فرزند کو میری اعانت سے دولت لازوال حاصل ہو گئی ہے، اگر میں مدد نہ کرتی تو آپ کی کشتی — تباہی کے گرداب اور گمراہی کی موجوں میں آ پھنسی تھی جس سے نجات پانا ناممکن تھا، یہ خواب دیکھا اور میری آنکھ کھل گئی۔

(باقی)

ہدایت حسین از بھوپال

غالب

غالب کا ذوق شعری فطرتاً فارسی کی طرف مائل تھا، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اردو دیوان کو کبھی اپنے کارنامۂ حیات کا مرتبہ نہیں دیا، بلکہ ہمیشہ اپنا مقابلہ فارسی اساتذہ شعر سے کیا ہے، اور اپنے کلام کو جگہ جگہ پر عرفی، نظیری، ظہوری وغیرہ شعرا کے ہم پایہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

چنانچہ ایک موقعہ پر بہادر شاہ سے آرزو کرتے ہیں کہ شاہجہاں کے عہد میں کلیم کو سیم و زر میں تولا گیا تھا۔۔ مگر میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اور کچھ نہیں تو میرا کلام ہی ایک مرتبہ کلیم کے کلام کے ساتھ تول دیا جائے، غالب کا یہ ادعا نازیبا نہیں ہے اور غالب نے اپنے ایک مقطع میں خود کو حزیں کے برابر کہا ہے یعنی

تو بدیں شیوۂ گفتار کہ داری غالب
گر ترقی نہ کنی شیخ علی را مانی

جو انصاف پسند سخن فہمی کا صحیح مذاق رکھتے ہیں وہ غالب کے خیال سے اختلاف نہ کرینگے، غالب کے اعمال سخن پر غائر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا درجہ سخنوری بہت ہی بلند اور عالی ہے اور ان کی قدر ان اہل کمال نے کی ہے جو خود فن سخن میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، اور دنیا کی علمی ترقیوں کے ساتھ ساتھ غالب کے قدردانوں کا برابر اضافہ ہوتا جائیگا۔ غالب نے جو جادۂ سخنوری اختیار کیا ہے وہ حد درجہ دشوار گذار ہے مگر غالب کی ہمہ گیر طبیعت نے جس رنگ میں قلم اٹھایا اور جس خیال کی مصوری کی وہ تمام اہل نظر کے لئے دلفریب ثابت ہوئی، غالب نے اپنی زندگی ہی میں معاصرین سے داد سخنوری حاصل کی، حکیم مومن خاں مومن، اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے کمال سخنوری سے کون واقف نہیں، یہ دونوں بزرگوار غالب کو ظہوری اور عرفی کا ہمپایہ کہتے تھے اور نواب ضیاء الدین خاں مرحوم کا قول تھا کہ ہندوستان میں فارسی شاعری ۔ ۔ ۔ کی ابتدا اور انتہا کہیں امیر خسرو سے ہوئی اور ترک ایبک (غالب پر) اس کا خاتمہ ہوا اور غالب کی نسبت اہل کمال کی یہ رائے ہے کہ اگر عربی شعر کی طرف توجہ کرتے تو متنبی یا ابو تمام ہوتے اور اگر زبان انگریزی کے شاعر ہوتے تو انگلستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتے دراصل یہ بیانات مبالغہ آمیز نہیں ہیں۔ اسلئے کہ اگر شاعر قدرتی طور پر لائق ہے تو وہ ہر زبان میں کمال دکھا سکتا ہے اور صاحب الرائے اشخاص ایسے کامل تسلیم

کر سکتے ہیں، میر کا کلیات، سعدی کی گلستاں، عمر خیام کی رباعیاں، دیوان حافظ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا کے علمی حلقوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں، غالب کا مجموعہ کلام بھی اسی قابل ہے کہ اگر کوئی لائق شخص ان کے چیدہ کلام کا ترجمہ انگریزی زبان میں کردے تو بہت رغبت سے ان کا کلام دیکھا جائے بمقابلہ دیگر اردو شعرا (باستثنا میر) غالب کا کلام جدید قابل تعلیم یافتہ اصحاب کے نزدیک بہت زیادہ اور خاص وقعت رکھتا ہے، اور اسکی وجہ یہ ہے کہ غالب کی شاعری میں محض مبالغہ اور صرف رنگ آمیزی اور خیالات دور از قیاس کی ٹھونس ٹھانس نہیں ہے۔ تغزل جسکی بنیاد زیادہ تر وصل اور ہجر اور باہمی رشک، معشوق کی بے وفائی اور عاشق کی ایذا پسندی وغیرہ وغیرہ امور پر ہے اور یہی سلسلۂ میر سے لیکر اس وقت تک برابر جاری ہے جو شخص اردو شاعری کے مختلف رنگوں کو گہری نظر سے دیکھ چکا ہے وہ تو ضرور یہ کہیگا کہ زیادہ تر پرانے ہی مضامین کو نیا لباس پہنایا جاتا ہے اور بہت کم ایسے مضامین نکلیں گے جو جدید کہے جا سکیں، قدیم شعرائے اردو کے کلیوں پر عمل درآمد چلا آتا ہے، مگر غالب نے اس حقیقت امر کو سمجھ لیا اور اسی وجہ سے انہوں نے چمنستان شاعری میں ایک نئی کیاری لگائی اور جس طرح ایک ماہر فن باغباں نئے گل بوٹوں اور پودوں کی فکر میں رہتا ہے، ایک درخت کی شاخ دوسرے میں لگاتا ہے، اسی طرح غالب نے ہندوستانی اردو میں شیراز و اصفہان کی چاشنی دی اور اردو کے قدیم کلیوں سے ہٹ کر غالب نے دیگر شعرا کے خلاف ہجر یار کو مکلف اور وصل کو راحت رساں نہیں سمجھا، یعنے وہ ہجر ہی میں لذائذ عشق کا احساس کرتے ہیں اور درد محبت ہی کو دارو سمجھتے ہیں۔

مضمون آفرینی میں گہرے جذبات عشق و محبت کا رنگ پیدا کرنا نہایت ہی اہم کام ہے اور مبالغہ میں واقعہ کی صداقت کا قائم رکھنا سحر ہے، مضمون کی تلاش اور اسپر صحیح قیاس قائم کرنا کہ یہ نیا ہے یا پامال آسان کام نہیں ہے اور یہ کام کاملین فن کا ہے عاشق کے دل عاشق کے گھر کی ویرانی کے اکثر مضامین ناظرین نے دیکھے سنے ہونگے لیکن غالب نے ذیل کے اشعار میں کیا بات پیدا کی ہے اور ویرانی کی تصویریں کیسی دلکش اتاری ہیں، سو بار پڑھیئے تو سو ہی بار دل متاثر ہو فرماتے ہیں۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

دشت کو دیکھ کے گھر کی یاد آنا عجیب بات ہے، لطف معنی سمجھنے والے اسکی داد دے سکتے ہیں کتنا نیا تقابل ہے اور یہ شعر بھی بالکل نیا ہے۔

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

گھر کی ویرانی سے بہار ثابت کرنا غالبؔ کا کام ہے، ویران گھر میں اور در و دیوار سے سبزہ کا اُگنا بدیہات سے ہے۔ مگر ہائے ری ناکامی کہ ایسی بہار بھی جب آئی کہ جب یہ گھر چھوڑ کر بیاباں میں آئے اور کس ملوسانہ انداز سے گھر کی یاد کی ہے غالب کی خیال آفرینی ہر جگہ ایک نیا مزہ دیتی ہے۔

غالب کی مشکل پسندی کو ان کے معاصرین نے بھی تسلیم کیا ہے اور حتی کہ بعض قابل اشخاص کے نزدیک غالب کے بعض اشعار صرف شوکت لفظی ظاہر کرنے والے ہیں، مگر نہیں یہ خیال غلط ہے بات صرف اتنی ہے کہ غالب اردو شاعری کے فرسودہ لباس کو اتارنا چاہتے تھے، اور اسی وجہ سے وہ اپنے معاصرین کے مشاعروں میں جو غزلیں پڑھتے تھے اس پر سرگوشیاں ہوتی تھیں اور یہ اسلیئے کہ انکی سخن طرازی کا رنگ جدا ہوتا تھا اور لوگ میر و سودا وغیرہ کے رنگ کے عادی تھے۔ میرے خیال میں یہ خیال اب تک قائم ہے۔ اب بھی ایسے لوگ ملیں گے جو غالب کے کلام کو عام فہم نہیں کہتے مگر یہ اعتراض نہ کبھی درست تھا اور نہ اب ہے اسلیئے کہ جدت پسند طبیعتیں تو لکیر کی فقیر نہیں رہ سکتیں غالب نے اگر اردو شاعری کی تراکیب اور خیالات میں کتر بیونت کی تو کوئی گناہ نہیں کیا اب سو برس کے بعد اگر کسی کا دماغ زبردست اور دل طاقتور ہو تو کوئی اور نئی بات پیدا کرے مگر ہم تو دیکھتے ہیں کہ یہ غالب ہی تھے جنہوں نے اپنی جدت پسندی میں کامیابی حاصل کی اور زمانہ نے یہ تسلیم کر لیا کہ ہاں ان کا طرز سخن سب سے الگ ہے، غالب نے اردو کا نظامی ایک مختصر سا دیوان لکھا ہے لیکن وہ بڑے بڑے ضخیم او جسیم دیوانوں سے بڑھا ہوا ہے۔ کلام کا زیادہ ہونا اچھے ہونے کی دلیل نہیں ہے بلکہ کلام کلام کی حیثیت سے ہونا چاہیئے چاہے وہ کم ہی کیوں نہ ہو، یہی خیال غالب کو مدنظر رہا ہے انہوں نے اپنے کلام کی روح نکال لی ہے اور اسی کو اپنے نام سے چھپوایا اور یہ نہیں کیا کہ غزل میں خرافات کو بھر دیا ہو۔ پچاس پچاس شعر کی جگہ چار پانچ پانچ کہیں دس گیارہ پر اکتفا کی ہے اور کہیں دو ایک ہی شعر لکھکر غزل تمام کر دی، اللہ اللہ کیا انتخابی لیاقت تھی۔ غالب کا یہ انتخاب اوروں کے لیئے ہدایت نامہ ہے، غالب دراصل فارسی کے شاعر تھے اور گو وہ کسی کے شاگرد فن شعر میں نہیں ہیں لیکن وہ فارسی میں نظیری اور بیدل کے مقلد ہیں اردو ہی ترکیبیں اور خیالات ان کے دل و دماغ میں بسے ہوئے ہیں اردو میں بھی وہی تراش خراش موجود ہے خود کہتے ہیں کہ

رنگ بیدل میں ریختہ لکھنا

اسد اللہ خاں قیامت ہے

بالکل سچ ہے، عاشقانہ مذاق میں اُردو شعر کو معنی خیز بنا دینا بڑے عالی دماغوں کا کام ہے غالب نے اپنے دیوان کا پہلا مطلع بطور حمد باری تعالیٰ لکھا ہے سرسری نظر سے دیکھنے والے کو امتیاز نہ ہو گا لیکن غور سے دیکھیئے تو عجیب رنگ میں حمد لکھی ہے اور کسی کے خیال کی تقلید نہیں کی ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

مصرعہ اولیٰ میں نقش کی وسعت معنوی کو دیکھیئے تحریر کی شوخی سے فریاد کی آمادگی کتنی نئی بات ہے کس لفظ کا نقش ایسا ہے جو معنی سے خالی ہے (مہملات کا ذکر نہیں) اور لفظ کا نقش کاغذ پر ہونا ظاہر اور کاغذ سے ہر لفظ پیرہن کاغذی پہنے ہوئے مصرعہ ثانی میں تلمیح ہے، یعنی ایران میں قاعدہ تھا اور شاید اب بھی ہو کہ فریادی پیراہن کاغذی پہنکر حاکم کے سامنے جاتا تھا، یہ مطلع مجاز اور حقیقت دونوں پہلو لیئے ہوئے ہے، انسان کا کالبد خاکی کیا ہے کچھ بھی نہیں یہ سارے کرشمے روح کے ہیں یہ گویائی یہ تکلم عقل و ادراک کس کی بدولت ہے، روح کی۔ اور روح کیا ہے، ساری چہل پہل شور و غل فریاد دم کے ساتھ ہے، ورنہ خفتگان خاک جو بے روح ہیں کیسے چپ ہیں۔ کاغذ پر اگر نقش نہ ہو تو بیقدر، الفاظ کے معنی ہی تو بولتے ہیں، بولتے کیا فریاد کرتے ہیں اور فریاد بھی کیسی کہ دوسرے سنکر دیکھکر سر دھنتے ہیں۔ غالب کا مطلع اپنی شرح کے لیئے وسعت بیان اور میدان چاہتا ہے، اور یہاں طول مقصود نہیں۔ سخن فہم ناظرین خود سمجھ سکتے ہیں صرف مرحوم کی شاعری مذاق سخن کو تازہ کرنا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

حضرات صوفیہ کا قول ہے کہ آتش عشق ماسوا اللہ کو پھونک دیتی ہے اور وہ سوائے خدا کے دنیا میں کسی کو موجود نہیں جانتے، حتیٰ کہ خود کو بھی بھول جاتے ہیں اور ہجر و وصل کا امتیاز نہیں رہتا اسی خیال کو غالب نے نظم کیا ہے۔

دل میں شوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں

آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

غالب اور مسئلہ عشق حقیقت کو یوں نظم کرے، غالب ترے مے آشام ہی نہ تھے جیسا انہوں نے خود کہا ہے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

غالب میکش تھے مگر مکار میکش نہ تھے ان کا مشرب صلح پسند تھا، واقعی وہ اس شغل سے سکر محوی اور سکر سہوی کی کیفیت حاصل کرتے تھے غالب اہل شریعت کے نزدیک چاہیے قابل معافی نہ ہوں لیکن انکی راستبازی اور اُن کا متصوفانہ مذاق قابل غور ہے وہ شرب مدام کو بُرا جانتے تھے لیکن تصوف اور توحید کے مسائل کو جس خوبی سے انہوں نے نظم کیا ہے اسکو انصافاً دیکھنا چاہیئے انہوں نے دبی زبان سے ادعائے ولایت کیا ہے گو یہ ادعا شاعرانہ ہے

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

سابق نواب صاحب رامپور نے شعر سنکر کہا کہ ہم تو جب بھی ولی نہ سمجھتے غالب نے ظریفانہ جواب دیا کہ حضور تو اب بھی سمجھتے ہیں ۔

(باقی)

غلام احمد لکھنوی

افکار فکری

حیاتِ چند روزہ کے یہی رہبر نکلتے ہیں — یہ جتنے میکدہ سے جام پی پی کر نکلتے ہیں
وہ ہوں ناکام حسرت سیکڑوں ارماں دل لیکر — ترانہ نکلے آئے تھے فغاں بنکر نکلتے ہیں
مرے نقشِ قدم پر چلنے والے راہ اُلفت میں — اگر گم ہو بھی جاتے ہیں تو منزل پر نکلتے ہیں
مقید زندگی سے لاکھ درجہ موت بہتر ہے — نکلتے ہیں قفس سے جان ہی دیکر نکلتے ہیں
بہار آتے ہی رندوں کو ہوئی پھر فکر مینوشی — کہیں شیشے نکلتے ہیں کہیں ساغر نکلتے ہیں

دل و ایمان و صبر و ہوش سب کچھ کھو چکے فکری
کسی بیدرد کی محفل سے اب لٹکر نکلتے ہیں

بشر فکری

پامپیائی کا دورِ آخرین

(سلسلہ ماہ گزشتہ)

باب ششم

آربی سس کا مذہب اور طریقہ تعلیم

رات اپنی سیاہ چادر دن بھر کے تھکے ہوئے شہر پر اڑھا رہی تھی کہ ایپی سی ڈس قیطلی کے گھر کو چلا، وہ شہر کے آباد اور پر رونق بازاروں سے الگ الگ ایک غیر آباد راستہ پر نگاہیں نیچی کیئے جا رہا تھا۔ دوسرے بے فکرے راہگیروں کی لاپرواہ صورت اور اسکے کمزور جسم اور غم آلود چہرے میں ایک بین فرق تھا،

کچھ دور چلا نہ پرایک راہگیر نے جو ویسا ہی سنجیدہ اور متفکر تھا، اسکے کندھے پر ہاتھ رکھکر آہستہ سے کہا ”ایپی سی ڈس“ اور دوسرے ہاتھ کے اشارہ سے صلیب کا نشان بنایا۔

ایپی سی ڈس۔ (چونک کر) او۔ عیسائی! کیا کہتے ہو“ اور اس کا چہرہ اور بھی زرد ہو گیا

اجنبی۔ میں تمھارے مراقبے میں مخل تو نہیں ہونا چاہتا، مگر پچھلی دفعہ جب میں تم سے ملا تھا، تو تم زیادہ کشادہ پیشانی سے پیش آئے تھے۔

ایپی سی ڈس۔ ”او لنتھس۔ تم سے ملنا تو مجھے اب بھی ناگوار نہیں گزرا۔ مگر میں بے چین اور تھکا ہوا ہوں۔ اسلیئے آج تمھارے ساتھ مذہبی گفتگو نہیں کر سکتا۔

اولنتھس۔ (زرد ہمدردی کے ساتھ) اے کمزور دل انسان۔ تم بے چین اور تھکے ماندے ہو لیکن اسپر بھی تم حق کے چشمہ سے جو تمھیں تازگی اور شانتی بخش سکتا ہے۔ بھاگتے ہو!“

نوجوان پوجاری نے بے اختیار ہو کر کہا۔ ہائے میں کیا کروں، کیا میں اس آدمی کی طرح یہ مان لوں کہ وہ معبود جنکو میرے باپ دادا پوجتے آئے ہیں۔ اصلی معبود نہیں ہیں یا آربی سس کے عقیدہ پر ایمان

لاؤں؟"

وہ کچھ دیر رکا۔ پھر جلدی جلدی قدم اٹھا کر چلدیا، گویا وہ اپنے متضاد خیالات کی جدوجہد سے خود بھاگنا چاہتا تھا، لیکن علیائی نے اسے یوں آسانی سے نکلنے نہ دیا، اور بڑھ کر اسے روک لیا۔ "ایپی سی ڈس، مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا کہ میری باتیں تمہاری گھبراہٹ کا باعث ہوتی ہیں، تم شک کے تاریک غار میں گم کردہ راہ ہو۔ لیکن صبر اور دعا سے کام لو۔ خدا تمہیں سیدھی راہ کی طرف ہدایت کریگا۔

ہمارا مذہب تھوڑی سی سخت قیود تو ضرور عائد کرتا ہو۔ مگر اس کے انعامات بھی وسیع ہیں، ایک ساعت کے ابتلا کے اجر میں یہ حیات جاوداں بخشتا ہے۔"

ایپی سی ڈس "ایسے ایسے سبز باغ ہی تو آدمی کو دھوکہ دیتے ہیں۔ کیسے کیسے وعدے مجھ سے کئے گئے تھے، جن کے بھروسے پر میں نے آئی سس کا پوجاری بننا اختیار کیا۔

علیائی۔ لیکن تم خود ہی سوچو۔ جس مذہب میں اخلاق کی تعلیم کا عنصر مفقود ہو وہ مذہب کبھی سچا ہو سکتا ہے، تم کو جن معبودوں کی پرستش کی تعلیم دی جاتی ہے، ان معبودوں کے کارنامے جو بیان کئے جاتے ہیں، وہ ایک بدافعال مجرم کارناموں سے کم نہیں۔ یہ کیا ہو؟ کیا یہ تعلیم تمہاری طینت کے اعلیٰ اور پاکیزہ جذبات کی تحقیر نہیں؟ آؤ۔ سچے خدا کی طرف جھکو، وہ خدا جسکا کوئی شریک نہیں اور جسکی وحدانیت کی ہم تلقین کرتے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کچھ نہ کچھ سمجھ رہے ہو۔ خدا تمہارے دل کے پردے کو ہٹا رہا ہے آؤ، آؤ۔ خدا کے آگے ہاتھ نہ روکو، ہمارے چند برادران ملت خدا کا کلام سننے کو جمع ہو رہے ہیں۔ آؤ میں تمہیں وہاں لے چلوں۔ تم غمزدہ اور مضطرب ہو، دیکھو خدا کیا جاہتا ہے، "تم جو بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہو، میرے پاس آؤ، میں تمہیں امن بخشونگا۔"

ایپی سی ڈس۔ "میں ابھی نہیں آسکتا۔ پھر کبھی سہی۔"

اولتھس۔ (جوش سے) ابھی ابھی۔" اور یہ کہکر اسنے اسکا ہاتھ پکڑ لیا، لیکن ایپی سی ڈس ابھی اس مذہب کو جس کے لئے اسنے اسقدر قربانیاں کی تھیں چھوڑنے کو تیار نہیں تھا، دوسرے قبطی کے وعدوں پر ابھی اسے بھروسہ تھا، اسنے زور سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا، اور اپنے کپڑے سنبھالتا ہوا اسقدر تیزی سے بھاگا کہ تعاقب بے سود تھا

تھک کر اور بے دم ہو کر وہ آخر شہر کے اس علیحدہ حصہ میں پہونچا جہاں قبطی کا مکان تھا

جب وہ دم لینے کو رکا تو روپہلی بادلوں میں سے چاند نکلا اور سامنے کے منظر پر چاندنی پھیلی۔ وہاں صرف ایک ہی مکان تھا۔ اسکے سامنے انگور کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں، اور عقب میں غم انگیز چاندنی میں جنگلی درختوں کے جھنڈ کھڑے تھے، ان سے دور فاصلے پر پہاڑیوں کے دھندلے نشان اور ان میں وسوویس کی چوٹی دکھائی دے رہی تھی، ایسا ہو کا عالم تھا کہ جب نوجوان پوجاری نے اس منظر پر نظر کی تو اس کا دل دھڑکنے لگا، مکان کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اسے اپنے ہی قدموں کی آواز سے خوف معلوم ہوتا تھا اسنے دروازہ پر دستک دی۔

دروازہ بغیر کسی آواز کے کھلا اور ملازم نے نکل کر ہاتھ سے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا، وسیع دالان کانسے کے بھاری بھاری لمپوں سے روشن تھا۔

دیواروں پر عجیب غریب شکلیں سیاہ اور خاکی رنگ سے بنی ہوئی تھیں۔

اٹلی کے لوگ عموماً اپنے مکانات کو شوخ اور چمکدار نقاشی سے آراستہ کرتے تھے، لیکن ان مکانات کی نقاشی اور اس خوف افزا مکان کی آراستگی میں بہت فرق تھا، دالان کے کسی دوسرے حصہ سے ایک اور غلام نکل کر ان کی طرف آیا۔

پوجاری نے کہا " مجھے آربی سس کی تلاش ہے اور اسکے کانوں کو خود اسکی آواز لرزتی معلوم ہوتی تھی۔ غلام نے خاموشی سے سر جھکایا اور ایپی سی ڈس کو ایک تنگ زینہ کی طرف لے گیا، کئی کمرے گزرنے کے بعد وہ ایک دھندلے نیم روشن کمرے میں قبطی تک پہونچے۔

آربی سس کے سامنے میز پر کئی قدیم کتبے قدیم قبطی خط میں لکھے رکھے تھے، تھوڑی دور پر ایک چھوٹی سی تپائی کے پاس ایک کرہ رکھا تھا، جسپر مختلف سیاروں کی جگہ کے نشان بنے تھے ایک میز پر طرح طرح کے عجیب و غریب شکل کے مختلف اوزار رکھے تھے۔

کمرے کا انتہائی حصہ ایک پردہ سے علیحدہ کیا گیا تھا اور چھت میں ایک کھڑکی تھی جس سے چاند کی شعاعیں کمرے کی ٹمٹماتے ہوئے لیمپ کی دھیمی روشنی سے ملکر ایک عجیب اثر پیدا کر رہی تھیں۔

قبطی نے بیٹھے ہی بیٹھے ایپی سی ڈس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

قبطی۔ (تھوڑی دیر خاموش رہ کر) ایپی سی ڈس۔ تم چاہتے ہو کہ میں تم سے وہ پوشیدہ اہم راز بیان کروں جو انسان کی انتہائی روحانیت قبول کر سکتی ہے، یہ زندگی کا راز ہے جو تم مجھ سے

پوچھنا چاہتے ہو۔ یہ بھید صرف حکماء پر کھلا ہے، اور حکما صرف اسکو اسکی تعلیم کر سکتے ہیں جو دلی عقیدت سے حق کا جویاں ہو، یہ کہکر قبطی نے پراسرار منطق اور مخصوص دلائل سے اس مذہب کے وہ اصول بیان کرنے شروع کئے جیسے اسکا اور آئی سس کے پیرؤوں کا ایمان تھا، مگر جو اصول وہ عوام الناس سے پوشیدہ رکھکر صرف فریب اور شعبدوں سے کام لیتے تھے، دیر تک وہ مذہبی نکات بیان کرتا رہا اور جب وہ خاموش ہوا تو ساتھ کے کمرے سے ایک نہایت دلکش اور شیریں سروں میں گانے کی آواز آئی، پوجاری اس وعظ کے جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس دلفریب گانے کی آواز نے اسے شرمندہ کر دیا اور جوابی الفاظ اسکے ہونٹوں سے باہر نہ نکل سکے۔ وہ حیران ہوکر گانا سننے میں محو ہوگیا۔ اسکے سنتے ہی سنتے گانے میں کئی اور سریلے گلے کی آوازیں شامل ہوگئیں اور اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا یہ کسی دوسرے عالم کی آوازیں ہیں۔

جب گانا بند ہوا تو آر بی سس نے اسے اٹھکر ہاتھ سے پکڑ لیا، اور پردے کی طرف چلا۔ پردہ کے پیچھے سے اچانک ہزار ہا لمپوں کی روشنی نکلی۔ گانا پھر شروع ہوا اب کے بلند اور اونچے سروں میں اور ساتھ ہی پردہ خود بخود سمٹ گیا اور ایپی سی ڈس کے سامنے ایک شاندار منظر پیش ہوا، ایک وسیع کمرا جو روشنی سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا، اور نہایت اعلیٰ درجہ کی خوشبوؤں سے معطر تھا، چھت کے ستون زر دوز اور جواہرات سے مرصع کپڑوں سے ڈھکے ہوئے تھے، کمروں کے کونوں میں فوارے پانی اچھال رہے تھے، پانی کے یہ قطرے جب نیچے گرتے تھے تو ہزار ہا لمپوں کی روشنی کے عکس سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہیرے اور جواہرات برس رہے ہیں، جب وہ کمرے کے وسط میں پہونچے تو فرش سے خود بخود ایک میز اٹھی جسپر انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے، میز کے اردگرد جو کوچ رکھے ہوئے تھے وہ نہایت قیمتی کپڑوں سے منڈھے ہوئے تھے،

اب زر دوز پردوں کے پیچھے سے نہایت حسین، جوان لڑکیوں کی ٹولیاں برآمد ہونی شروع ہوئیں، بعض ہاتھوں میں پھولوں کے ہار اور بعض طنبورہ و سارنگیاں لئے تھیں، انہوں نے آکر ایپی سی ڈس کو نیچ میں گھیر لیا اور اسطرح میز تک لے گئے۔ ان انہوں نے اسکو ہار پہنائے، اور ان میں سے ایک نے جھک کر چمکتی ہوئی شراب کا پیالہ پیش کیا، اس زاہد فریب اور توبہ شکن ساقی کے ہاتھ سے جام شراب ایپی سی ڈس لینے سے انکار نہ کر سکا،

اسی عرصہ میں آر بی سس کمرے کے دوسری طرف چلا گیا، جب ایچ سی ڈسس نے آنکھ اٹھا کر اسکی نگاہ کی تو اس نے دیکھا کہ آر بی سس ایک مرصع شامیانے کے نیچے بیٹھا اسکی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا، وہ اب سیاہ پوش تھا ملکہ سفیہ براق خلعت جسپر جواہرات جڑے تھے وہ زیب تن کئے تھا، اسکے سر پر سفید پھولوں کا تاج تھا جسپر ہیرے چمک رہے تھے۔

آر بی سس۔ "اے میرے پیارے شاگرد دیکھو اور کھاؤ"، اپنی موجودہ حالت تو تم دیکھ ہی رہے ہو ادہر دیکھو کہ تمھارا انجام کیا ہے؟"۔

یہ کہکر اسنے دیوار میں ایک طاق کی طرف اشارہ کیا، ایچ سی ڈسس نے ادہر نگاہ کی تو اسنے دیکھا کہ ایک تپائی پر انسانی پنجر رکھا ہوا ہے۔

قیطی۔ خوف سے مت چونکو، یہ خاموش پنجر ہمیں زندگی کی کوتاہی کا سبق دیتا ہے اسکے خوفناک منہ سے میں آواز سن رہا ہوں۔

بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

(باقی) برکت علی

غزل

فرقت میں اور آہ کوئی بھر کے دیکھ لیں
اسپر بھی وہ نہ آئیں تو پھر مر کے دیکھ لیں

بیخود ابھی نہ کر ہمیں وہ جلوۂ جمال
تھم جا ذرا کہ ہم انہیں جی بھر کے دیکھ لیں

جب زندگی ہی موت سے بدتر ہے ہجر میں
مرنے میں اور کیا ہے کہ ہم مر کے دیکھ لیں

بتلا دو کہ زیست میں ممکن نہیں وصال
کہہ دو نہ صاف صاف کہ ہم مر کے دیکھ لیں

محشر میں تم ملو نہ ملو اعتبار کیا
آجاؤ وقت مرگ کہ جی بھر کے دیکھ لیں

مشکل نہ رہبری ہو اثر راہ عشق میں
نقش قدم بھی گر کسی رہبر کے دیکھ لیں

جعفر حسین اثر

آخری سحر!

آ، اے میری پیاری زندگی، میری عزیز زندگی کی آخری سحر، آ، آجا، دیکھ میری روح تیرے استقبال کے لئے بے چینی کے ساتھ لبوں پر آگئی ہے، میرے جسم کی تمام طاقتیں، تو میں بڑے تپاک سے تیرا خیر مقدم کر رہی ہیں، اور جس طرح میں تجھے روحانی اور غیر مرئی طور پر اپنے سینہ سے لگا لینا چاہتا ہوں، تجھے جی بھر کے پیار کرنے کا آرزومند ہوں اے کاش جسمانی طور پر بھی میں تجھے اپنی آغوش محبت میں لے سکتا۔

آہ، میں تجھ سے رخصت ہوتا ہوں بچھڑتا ہوں، نہیں نہیں بلکہ تو مجھے ہمیشہ کے لئے اپنے سے جدا کر دینا چاہتی ہے مجھے الوداع کہہ دینا چاہتی ہے، افسوس! افسوس........

کل میں تیری سہانی اداسیاں تیری خاموش دلفریبیاں نہ دیکھ سکونگا، آہ جب میں یہ خیال کرتا ہوں جب یہ بات سوچنے لگتا ہوں تو میری روح حرص سے لرزنے لگتی ہے، میرا صبر و سکون ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے، پاش پاش ہو جاتا ہے، اور میرے خیالات وحسیات اضطراب و گھبراہٹ کے سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں۔

پیاری سحر! تو تو آج کی طرح ہمیشہ کی طرح روز آیا کرگی، پھیرے کیا کرگی، اور اپنے نئے مشتاقوں اور اپنے تازہ گرفتاروں کی افسردہ روح میں نئی زندگی پیدا کرتی رہے گی، مگر آہ میں بدنصیب ایسی جگہ پہونچ جاؤنگا جہاں تیری ٹھنڈی ہوا کے دلنواز جھونکے جہاں تیری روح پرور نسیم کی پہنچ دہی اور اٹھکھیلیاں مجھ تک نہ آسکیں گی، تیری تمام دلچسپیاں اپنے کو مجھ تک نہ پہونچا سکیں گی، اسلئے آ میری بیوفا عمر کی آخری سحر آ، میری زندگی کا لبریز جام چھلکا دے بیساختہ بے اختیار میرے گلے لگ جا، کیونکہ میں تجھ سے پھر کبھی کہیں نہ مل سکونگا۔ ہر چند میرا دل میرے پہلو ہی میں رہے گا لیکن میں اس کے اندر تیرے تشنہ آدر انتظار کی تڑپ اور بے چینی نہ پیدا کر سکونگا۔ میری آنکھیں بدستور رہیں گی مگر تیرے انتظار میں پتھرائیں گی نہیں۔

دنیا کے لیۓ اسی دنیا میں میرا نہ رہنا ایک خسران ہے، ایک نقصان ہے میرے بعد دنیا کے باغوں کے پھول شگفتگی سے پہلے مرجھا جائینگے، کمھلا جائینگے۔ سربند کلیاں میرے ماتم میں اپنے گریباں پھاڑ ڈالیں گی کھلے ہوئے پھولوں کی مہک میرے غم میں آوارہ پھرے گی، بلبلوں کی نغمہ سنجیاں میری نوحہ خوانی میں تبدیل ہوجائینگی، طائران خوش الحان کے دلکش زمزمے سوگوار چیخیں اور گریہ وزاری ثابت ہونگے باد صبا ہمیشہ ہمیشہ میرے غم میں خاک اڑاتی پھرے گی، غرض دنیا کا نقشہ ہی بدل جائیگا، تبدیل ہوجائیگا۔

لیکن آہ میری آخری سحر یہ میرا آج معمول سے زیادہ دل کیوں دھڑک رہا ہے، یہ میرے کلیجہ پر کون چھری چلا رہا ہے، یہ میرے سینہ میں دبی ہوئی آگ کیوں بھڑک رہی ہے، یہ میرا قلب سوزاں آتشدان کی ہیئت میں کیوں تبدیل ہوگیا ہے۔ اُف یہ میری سانس کیوں بھاری ہورہی ہے، یہ میرا گلا کیوں بھیجا جاتا ہے، میرا حافظہ میری گذشتہ زندگی کی دلچسپیاں کیوں یاد دلا رہا ہے، میرے مخیلہ میں دور ہائے عشق کی جیتی جاگتی دھندلی تصویریں کیوں جمع ہورہی ہیں، آہ بتا تو سہی اے میری پیاری آخری سحر یہ میرا سر کیوں چکرا رہا ہے، میری نبضیں کیوں ساقط ہورہی ہیں، میری آنکھیں کیوں پتھرائی جاتی ہیں، میری زبان کیوں تھرائی لڑکھڑائی جاتی ہے، میری سماعت میں کیوں ثقل لاحق ہوتا جاتا ہے اور مختصر یہ کہ میری تمام فطری طاقتیں ایک ایک کرکے مجھے جواب دے رہی ہیں مجھ سے منہ موڑ رہی ہیں۔

آہ! تو کچھ جواب نہیں دیتی تو کچھ نہیں بولتی، تیری خاموشی تیرا یہ سکون وسکوت تیری یہ ادائے بے نیازی کجرخی، بے پروائی میرے دل پر میری روح پر میرے جذبات پر میرے وجدان پر نشتروں کا کام کررہی ہے، اچھا تو نہ بتا میں خود سمجھ گیا میری حالت نوید موت ہے،

آہ موت کیا چیز ہے، اے میری پیاری آخری سحر تو ہی بتا، موت کسے کہتے ہیں کیا یہ میری زندگی کا پردہ ہے، کیا یہ میری محبت کا سربستہ راز ہے کیا وصال یار کا مقدمہ ہے، آخر ہے کیا چیز، ہاں اب سمجھ میں آیا جسے موت کہتے ہیں وہ تو ہی ہے اے میری آخری سحر موت بھی تیرا ہی نام ہے۔

افسوس! افسوس میں موت کی حقیقت آج تک نہیں سمجھا تھا اب اس آخری وقت اس عالم نزع میں مجھے علم ہوا، مگر اے موت اے میری آخری صبح تو تو بڑی دلکش اور دلچسپ ہے تجھ میں ہزاروں دلفریبیاں ہیں، میں تجھ سے اسوقت نادم ہو رہا ہوں، پشیمان ہوں کہ میں تجھ سے ہمیشہ ڈرتا لرزتا رہا کانپتا رہا اور تجھ سے ذرا بھی لطف اندوز اور مسرور نہ ہو سکا۔

(مظفر۔ حزین)

غزل

سوز غم فراق سے جاں لبوں پر آئے کیوں
مرنے سے پہلے آدمی بس ہو تو مر نہ جائے کیوں

برق تھی یا کہ وہ نظر پھونک دیئے دل و جگر
ایسی ہی چھیڑ ہے اگر جلوہ کوئی دکھائے کیوں

زندگی ایک خواب تھی خواب ہی میں بسر ہوئی
کھلتے ہی آنکھ بند تھی، کچھ نہ کھلا کہ آئے کیوں

ذوق فنا میں بیخودی عشق کی پردہ دار ہے
درد مجھے ستائے کیا، ہجر مجھے رلائے کیوں

کوفت سے اب یہ حال ہے تار نفس ہے زخمہ زن
نغمۂ جو دلگداز ہو روح تڑپ نہ جائے کیوں

تو ہی جو مہرباں نہیں سادہ ورق ہے زندگی
حرف غلط ہے آرزو دل نہ اسے مٹائے کیوں

دیکھنے کا نہیں شعور سب ہے نگاہ کا قصور
ہم کو جو دیکھتا رہے ہم سے وہ منہ چھپائے کیوں

محشر انتظار میں دل کی بساط ہی تھی کیا
طالب دید سے اثر آنکھ نہ وہ چرائے کیوں

جعفر علی خاں اثر
(ڈپٹی کلکٹر الہ آباد)

"ہند عہد اورنگ زیب میں"

پر

تبصرہ

یہ کتاب مرزا یار جنگ سمیع اللہ بیگ صاحب چیف جسٹس حیدرآباد دکن کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ جسے فاضل موصوف نے مسٹر جے۔ آر۔ رائے صاحب کے مضمون "ہندوستان عہد مغلیہ میں" کی تردید میں تحریر فرمایا ہے،

مسٹر جے آر۔ رائے صاحب کا یہ مضمون ۱۹۲۳ء میں رسالہ زمانہ (کانپور) کے مارچ و اپریل نمبر میں شائع ہوا تھا جسمیں لائق مضمون نگار نے اورنگ زیب عالمگیر اور حکومت مغلیہ پر اُن فرسودہ اور بے بنیاد الزامات کا اعادہ کیا ہے جنکی بے وقعتی عالم آشکارا ہو چکی ہے، اور بار بار دُہرائے جانے کے باعث اب اس عنوان میں بھی کوئی دلکشی اور ندرت باقی نہیں رہی لیکن جے۔ آر۔ رائے صاحب کو اس شرمناک سبق کے دہرانے کے لیئے شدھی اور سنگٹھن کے فسادات" کے موقعہ سے زیادہ بہتر دوسرا کامیاب موقع ملنے کی توقع نہ تھی، اسلیئے مضمون نگار صاحب نے اس موقعہ سے جو انکی خوش قسمتی اور ملک کی بدقسمتی سے انہیں حاصل ہوگیا تھا پورا فائدہ اٹھایا، اور اسطرح وہ "بزعم خود" ایک بڑے فرض سے سبکدوش ہوگئے،

مرزا یار جنگ صاحب نے معترض موصوف کے اُن اعتراضات کا خلاصہ کتاب کے باب اول میں نقل کیا ہے، اور ہم بھی اس مقام پر اس خلاصہ کو درج کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو بھی اعتراضات کی اہمیت معلوم ہو جائے:-

عہد مغلیہ میں رشوت کا بازار گرم تھا، رعایا مفلوک الحال تھی، اور بہت تنگدستی سے بسر کرتی تھی، عوام کی اقتصادی و تمدنی حالت سنوارنے کی کوشش نہیں کیجاتی تھی، وزرائے سلطنت نیک نفس و مردم شناس اور منتظم نہ تھے، تجارت پر ایسی تباہ کن قیود عائد تھیں کہ جن سے اُس کی ترقی دشوار تھی، صداقت نابود تھی، فرامین شاہی کی کوئی حقیقت نہ تھی، انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا دشوار تھا، سمندر میں بحری قزاقوں کے بیڑے پھرا کرتے تھے، اندرون ملک راہزنوں کا زور تھا

مغلوں کا لشکر ایک بے قاعدہ فوج کا مجمع تھا، بڑا حصہ زمیں کا ویران اور غیر آباد تھا، کالج اور تعلیم گاہوں کا قائم کرنا دشوار تھا"

رائے صاحب نے ان الزامات کو صحیح ثابت کرنے کے واسطے الیسٹ انڈیا کمپنی کے گماشتوں کے اُن خطوط سے استناد کیا ہے جو مختلف اوقات اور سنین میں انہوں نے ڈائرکٹرس کمپنی کو ولایت اطلاعاً تحریر کیئے تھے، اور جنکی بے وقعتی کپتان الگذ نڈر ہملٹن سیاح کے سفرنامہ کے اُس اقتباس سے ــــــ جسے فاضل مصنف نے کسی مقام پر اپنی کتاب میں نقل کیا ہے، بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔

مرزا یار جنگ نے اس کتاب میں مذکورہ بالا اعتراضات سے علیحدہ علیحدہ بحث فرمائی ہے اور بکمال خوبی اس کو غلط ثابت کیا ہے۔ مرزا یار جنگ صاحب نے اپنی بحث کی بنیاد کسی مسلم مورخ یا غیر معتبر "وقائع نگار" کے بیانات پر نہیں رکھی ہے، بلکہ ایک معتبر انگریز سیاح کے چشم دید حالات و واقعات سے استدلال کیا ہے۔

یہ انگریز کپتان الگزنڈر ہملٹن ہے، جو ۱۶۸۸ء میں جبکہ اورنگ زیب عالمگیر کی شاہنشاہی کی سطوت و جبروت کا پرچم لہرا رہا تھا، ہندوستان وارد ہوا تھا، اور تقریباً ۳۵ سال تک مسلسل بسلسلہ تجارت سفر و سیاحت کرتا رہا، اور اسی اثنا میں اسنے اپنا سیاحت نامہ مرتب کیا تھا، جو دوسری بار ۱۷۳۹ء میں طبع ہوا، اور اسوقت بھی اُس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود و محفوظ ہے۔

مرزا یار جنگ صاحب نے رفع اعتراضات و الزامات کے بعد اخیر باب میں ہندو مسلم نفاق کے اسباب اور اتحاد کی تدابیر سے بھی بحث فرمائی ہے، اور تمہید کتاب میں خاص طور پر ناظرین کو اس باب کی طرف متوجہ کیا ہے اور اسی بحث کے ضمن میں فاضل مصنف نے "مسئلہ خلافت و پان اسلامزم" کے متعلق بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ چنانچہ ہندو مسلم نفاق اور کشیدگی کے متعلق جناب کا ارشاد ہے:-

"میری رائے میں اس کا فیصلہ تو اُسی روز ہو گیا تھا جبکہ مسلمانوں نے اس ملک کو اپنا وطن قرار دیا تھا۔ لیکن بعض وقت کچھ تو خود مسلمانوں کے طرز عمل سے اور بعض وقت غلط فہمی سے انکی (مسلمانوں کی) حب الوطنی کی نسبت شبہات کیئے جاتے ہیں، شبہات پیدا کرنے والا طرز عمل عموماً اُن جذبات میں مضمر ہوتا ہے، جن کا اظہار وہ "مسئلہ خلافت" اور "پان اسلامزم" کے سلسلہ میں کیا کرتے ہیں یا کسی عارضی جوش میں محض زبان سے یہ کہہ گزرتے ہیں، کہ ہم "مسلم" پہلے ہیں "ہندی" بعد کو ہیں۔ بس یہی ہمارے وہ نمائشی جذبات ہیں جو سیاسی مطلع کو غبار آلود کر دیتے ہیں اور ہندوستان کے متعلق ہمارے صحیح نقطہ پر جو ایک

مسئلہ ہی پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔"

مجھے جناب موصوف کے ان خیالات سے صرف اصولی اختلاف ہی نہیں بلکہ حیرت ہے کہ یہ ایک ذمہ دار تعلیمیافتہ مسلمان کے قلم سے کیونکر نکل سکے۔ افسوس

تپاک گرمی رفتار باغبانم سوخت

اقتباس مندرجہ بالا سے یہ سمجھنے میں غالباً کسی تکلف و تامل کی ضرورت نہیں کہ ہمارے فاضل محترم کے نزدیک، مسلمانوں کا خلافت کے لئے جدوجہد کرنا، اور مسلم پہلے اور ہندی بعد کو ہونے کا اعتراف و اعلان کرنا ہی ہندو مسلم نزاع کا اصلی سبب ہی لیکن یہ کسی طرح صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان جذبات اسلامیت اور سعی خلافت کو نمائشی کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ ہندو مسلم کشیدگی کا سبب اصلی ہندو برادران وطن کی تنگدلی اور غیر ضروری وغیر معمولی تعصب ہے، جسکو اجنبی حکومت کی کوششوں کا نتیجہ کہنا چاہیئے۔ اور جس کا خود فاضل موصوف اپنی کتاب کے ہر ہر صفحہ میں ضمناً یا صراحتاً اعتراف فرمایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندو مسلم نفاق اور کشیدگی کی تاریخ اسلامی حکومت کی تباہی کے بعد سے شروع ہوتی ہے اور اسلامی حکومت کی تاریخ ہندو مسلم نزاع نفاق کے واقعات سے نہ صرف خالی ہے، بلکہ وہ باہمی محبت و یگانگت کے واقعات کا سبق آموز افسانہ ہے۔ بلاشبہ اسلامی تاریخ کے اوراق بغیر کسی کاوش کے ہندو مسلم اتحاد و محبت کے ثبوت میں تاریخی شواہد کا ایک ایسا انبار پیش کر سکتے ہیں، جو اپنی واقعیت کے اعتبار کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ اسوقت کے مسلمان مقابلۃً زیادہ مذہبی زیادہ راسخ العقیدہ اور فدا کار مسلمان تھے، پس اگر محض مسلمان ہونا یا کسی ایسے مسئلہ کی حمایت کرنا جسکی حمایت کے لئے وہ مذہبًا مجبور ہیں وجہ نفاق ہو سکتا ہے تو اسوقت ہندو مسلم نفاق کی خلیج زیادہ وسیع ہونا چاہیئے تھی، لیکن ایسا نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ہماری نزاع کا سبب فی الحقیقت کچھ اور ہے، اور وہ اجنبی اقتدار کی اندرونی دراندازیاں ہیں،

فاضل مصنف نے مسلمانوں کے اس خیال کو کہ مسلم پہلے ہیں اور ہندی بعد کو، نمائشی اور عارضی قرار دیکر مسلمانوں پر ایسا بے دردانہ اور ظالمانہ اتہام لگایا ہے کہ جسکو کوئی مسلمان برداشت نہیں کر سکتا، اس لفظ کو نمائشی قرار دینا مسلمانوں کی روایات اور انکی مقدس تاریخ سے انکار کرنا بلکہ دین حنیف پر حملہ کرنا ہے، یقیناً سب سے پہلے مسلمان، مسلمان ہیں اور بعد کو ہندی، افغانی، ترکی ہیں، اور ان کا "سب سے پہلے مسلمان ہونا" شہریت

یا وطنیت کے حقوق اور غیر مسلم ہموطنوں کے ساتھ محبت اور اتحاد کی زندگی بسر کرنے میں کسیطرح حائل نہیں، اسلام کی تعلیمات عالیہ کا بھی وہ امتیاز ہے جسکی بنا پر مذہب اسلام تمام ادیان و مذاہب عالم میں برتر اور مکمل ہونے کا دعوی کر سکتا ہے۔ اسلام مسلمانوں کو دنیا میں امن و رحمت کا فرشتہ بنکر زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے خونریزی اور بدامنی کا خوفناک عفریت بنکر نہیں۔

کہ در طریقت ما غیر ازیں گنا ہے منیت

فاضل موصوف نے اسی سلسلہ گفتگو میں جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں مسئلہ خلافت سے بھی بحث فرمائی ہے، چنانچہ آپ کی رائے میں اسوقت جس خلافت کے لیئے ہم جدوجہد کر رہے ہیں اس خلافت سے سیاسی خلافت مراد ہے، جسکا ابتدائے اسلام سے اسوقت تک اسلامی تاریخ میں کہیں وجود نہیں پایا جاتا حتی کہ خلافت راشدہ بھی سیاسی خلافت نہ تھی اور نہ اب کوئی ایسی خلافت قائم ہو سکتی ہے، اسلیئے مسلمانوں کو ایک موہوم شے کی طلب میں اپنا وقت اور اپنی قوت نہیں ضائع کرنا چاہیئے بلکہ خلافت کی تحریک کی الجھنوں سے الگ ہو کر نہیں ہندوستان کی فوز و فلاح اور آزادی کے لیئے کوشش کرنا چاہیئے۔

آپ نے اس رائے کی تائید میں چند مشہور واقعات کو پیش کیا ہے، لیکن محض چند مخالف واقعات کا پیش کر دینا کسی حقیقت سے انکار کرنے کے لیئے کافی نہیں ہو سکتا، خصوصاً جبکہ موافقت میں بھی تاریخی شواہد و واقعات کا ایک کثیر ذخیرہ موجود ہو۔

تحریک خلافت کے سلسلہ میں مسئلہ خلافت پر اسقدر کافی بحث ہو چکی ہے کہ اسکے بعد خلافت کی حقیقت اور اہمیت میں کسی قسم کا شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا، چہ جائیکہ انکار۔

اسلیئے یہاں پر کسی تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، البتہ مصنف کا یہ فرمانا کہ خلافت کا قیام ناممکنات سے ہے قابل غور ہے، میں فاضل جناب سے نہایت ادب سے عرض کرونگا کہ خلافت کا قیام نہ کل محال تھا نہ آج، بشرطیکہ مسلمان چاہیں، مگر یوروپین پروپگنڈا نے جو باتیں رفتہ رفتہ ہمارے ذہن نشین کرا دی ہیں ان کا منشا البتہ محال ہے اور صرف یہی محال ہمارے عملی نظام کی تباہی کا باعث ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر آج ہم اپنی اس ذمہ داری کو جو بحیثیت مسلمان ہونے کے عائد ہوتی ہے محسوس کر لیں تو تمام وہ امور جو آج محال نظر آتے ہیں وہ بآسانی ممکنات کی صورت اختیار کر سکتے ہیں، لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ مغربی مادیت کے اثر نے ہماری روح اور ضمیر کو بالکل مردہ کر دیا ہے، اور اب کسی حرکت کی بدشواری ہی امید کی جا سکتی ہے۔

فاضل مصنف کے ان خیالات کے متعلق بہت کافی بحث کی گنجائش نکلتی ہے، لیکن یہ مقام اس بحث کے لیے موزوں نہ تھا، اسلئے صرف چند ضروری اور ناگزیر اشارات پر اکتفا کرنا پڑی۔

ان مسائل کے بعد مصنف نے ہندو مسلم اتحاد کی تدابیر پر روشنی ڈالی ہے اور کانگریس کو انپر عمل پیرا ہونے کی دعوت دی ہے، اور اسمیں شک نہیں کہ باستثنا بعض، تمام تجویزیں مفید اور قابل عمل ہیں، اگر کانگریس ان پر عمل کرسکی تو یقیناً ہندو مسلم اتحاد کو فائدہ ہوگا۔

سعید رزمی

غزل

تربت نہیں میری ہے یہ خاکا　　اندوہ و فراق جانگزا کا

پایا یہ جواب التجا کا　　منہ دیکھ رہا ہوں بے وفا کا

پوچھو مری حسرتوں سے پوچھو　　عالم مری آہِ نارسا کا

واں عفو کی دھوم ہو رہی ہے　　یاں قصد نہیں ابھی خطا کا

درباں کی خوشامدوں میں کھویا　　وہ وقت کہ خاص تھا دعا کا

ہم اسلئے خاک ہو رہے ہیں　　ارمان ہے وصال نقشِ پا کا

تربت جسے تم سمجھ رہے ہو　　یہ ہے مری حسرتوں کا خاکا

شہید مرحوم

سانچی

خطۂ سانچی ہے بیشک رشکِ باغِ جناں
نازشِ بھوپال، فخرِ ہند، رشکِ گلستاں

ہمسرِ چرخِ بریں رفعت میں اُسکے کوہسار
اُسکے صحرا سربسر شاداب و سبز و بےخزاں

روح پروردہ ہوائیں وہ مناظر دلفریب
اور وہ گلہائے رنگا رنگ سے پُر وادیاں

کتنے فرحت بخش کیسے پرفضا ہیں سبزہ زار
اور دامن میں بھری ہیں کسقدر رنگینیاں

سرزمینِ ہند جیسے منتخب ہے دہر میں
خطۂ سانچی ہے یوں ہی ہند کا روحِ رواں

اے در و دیوارِ سانچی، اے نشانِ رفتگاں
یادگارِ عظمتِ دیرینۂ ہندوستاں

مدفنِ اصحابِ دانش، مسکنِ اربابِ فن
مرکزِ علم و عمل، گہوارۂ روحانیاں

دورِ ماضی میں تو ہی تھا چشمۂ حسنِ ازل
اہلِ دل اہلِ نظر تسکین پاتے تھے جہاں

کیوں نہ ہو تیری زمیں اب بھی زیارت گاہِ ہند
جبکہ ملتا ہے تجھی سے بے نشانوں کا نشاں

تجھ سے اب تک ہی نمایاں شوکتِ عہدِ اشوک
ہے جلالِ بودھ اعظم تیرے دامن میں نہاں

تیرا ہر پتھر ہے تاریخِ کہن کا اک ورق
تیری ہر تصویر ہے، اک داستانِ باستاں

تیرے آثارِ قدیمہ اور ترے نقش و نگار
تین سو قبل مسیحی کا دکھاتے ہیں سماں

اُس زمانہ کا تمدن، اُس زمانہ کا مذاق
اُس زمانہ کی ترقی اس زمانہ کی زباں

ٹوٹے پھوٹے کچھ نشاں اب بھی بتاتے ہیں ہمیں
تارک الدنیا رہا کرتے تھے عزلت میں یہاں

چند گنبد رہزنوں سے آج بھی محفوظ ہیں
جنمیں ہیں آرام فرما کچھ مقدس ہستیاں

ایک پتھر کا پیالہ بھی ہے کچھ ٹوٹا ہوا
طالبانِ علم کا صدیوں رہا جو میزباں

خشک سا اک مخزنِ آب آج بھی موجود ہے
جس سے پیاسے علم کے تر کرتے تھے کام و دہاں

بودھ کا جشنِ ولادت ترکِ دنیا انتباہ
جستجوئے منزلِ مقصود میں سرگرمیاں

نخل دانش اور استغراق و اطمینان قلب　　اور جنگل سے نکل کر اُس کا وہ بہلا بیاں
اُسکی تعلیم محبت اور ضبطِ جوشِ نفس　　اور وہ ترکِ عیال و مال و ننگ و خانماں
اُسکی ایذا کے لیئے وہ دشمنوں کی سازشیں　　رات کو اک پُرخطر مندر میں اُسکا امتحاں
آتشِ و مارِ گزندہ اور دیوانِ مہیب　　آخرش اُس نیم جاں کی ان بلاؤں سے اماں
وہ مصائب اور وہ استقلال وہ ترویج دیں　　اور وہ ہنگامۂ شیون وہ مرگِ ناگہاں
بعد مردن اُسکی مشتِ خاک پر جنگِ عظیم　　اور بننا مرجع مخلوق اُس کا آستاں
نخل دانش کی پرستش اور اشوکا کا جلوس　　الغرض اس قسم کی ہیں سیکڑوں نقاشیاں

علم آثار قدیمہ کی ترقی کے لیئے　　خسرو بھوپال نے کھدوا کے کچھ ٹوٹے مکاں
سعی و کوشش سے نکلوائی ہیں اشیاء قدیم　　اور وہ اک میوزیم میں ہیں حفاظت سے وہاں
آہنی سامان و آلات اور اشیاء ئے گلی　　جنکے مصنوعات موجودہ کا ہوتا ہے گماں
مختلف عہدوں کے کتبے، مختلف لوگوں کے بت　　مختلف شاہوں کے سکّے مختلف صناعیاں

جن کے نظارے کو یورپ تک سے کرتے ہیں سفر
علمِ تاریخ اور آثارِ کہن کے رازداں

محمود اعظم فہمی

سانچی حدود بھوپال میں اپنی قدامت کے اعتبار سے ایک عجیب جگہ ہے۔ آئندہ کسی نمبر میں اسکے تاریخی حالات ہدیہ ناظرین ہوں گے۔

نوجوان بیوہ کے جذبات

اک جہانِ بے بسی ہوں، اک جہانِ بیکسی / مسکراہٹ، میرے ہونٹوں پر نہیں آتی کبھی

بھولی بیٹھی ہوں کسے کہتے ہیں دنیا میں خوشی / انبساطِ دل ہے کیا؟ اس کی نہیں کچھ آگہی

مدتوں سے، مردنی چہرہ پہ ہے چھائی ہوئی

شام تنہائی ہے، مہماں میرے گھر آئی ہوئی

وہ جدا مجھ سے ہوئے کیا، ہوگئی دنیا جدا / دیکھتی ہوں جس کو آتا ہے نظر "روٹھا ہوا"

اپنے، بیگانے ہوئے ہیں، آشنا نا آشنا / اے مری قسمت، مرے اللہ، یہ کیا ہو گیا

خانۂ دل جو کبھی تھا صد بہارِ لالہ زار

حسرت و ارماں کا ہے اب شکستہ سا مزار

دشمنوں کو بھی میسر ہو نہ ایسی زندگی / ہے ندامت کا سبب اور باعثِ شرمندگی

اب وہ پیشانی پہ پہلی سی کہاں تابندگی / دور ہی سے آہ ایسی زندگی کو بندگی

رنج کی تفسیر ہوں میں درد کی تصویر ہوں / قیدِ زنداں خانۂ عالم میں بے زنجیر ہوں

خوفِ عقبیٰ ہے، نہیں دنیا کی کچھ پروا مجھے / درسِ جانبازی لیا ہے میں نے شمعِ بزم سے

وہ مصیبت، عیش و راحت ہے جسے اللہ دے / چند روزہ بیوگی کاٹوں گی جیسے بھی کٹے

شانِ محبوبی نہیں ہر چند وہ خوبی نہیں

کون کہہ سکتا ہے لیکن صبرِ ایوبی نہیں

لگ گئی چپ ایسی گویا مجھ میں گویائی نہیں / کوئی رعنائی نہیں ہے کوئی زیبائی نہیں

اب وہ خود بینی نہیں ہے اب وہ خود رائی نہیں / میں تمنائی نہیں ہوں کوئی شیدائی نہیں

اے گزشتہ زندگی اے دورِ لطف و انبساط

تیری یاد اب بھی ہے میرے واسطے وجہِ نشاط

ہاتف بھوپالی

غزل

مرے دوستوں کا خیال ہے کہ جو اس سکے بچا نہیں
یہ حریف فہم و ذکا نہیں یہ شریک عقل رسا نہیں

دل دردمند کی داستاں یہ سبیل ذکر تھا اک بیاں
ہوئے سنکے تم جو عرق فشاں، بخدا تمھارا گلا نہیں

غم یاس میرے خمیر کا ہے ازل سے عنصر نا جدا
وہ شگوفہ ہوں کہ کھلا نہیں، وہ نہال ہوں جو پھلا نہیں

ہے جہاں سکون میں سو رہا نہ تڑپ مگر دل مبتلا
تجھے کسکے وعدوں پہ ہے یقیں اُسے پاس عہد وفا نہیں

ہوئے دلدہی سے وہ آشنا مگر اب ہے چارہ گار کیا
مرادرد پہنچا ہے اُس جگہ کہ جہاں حدود شفا نہیں

وہ مریض ناصر ناتواں جسے زندگی تھی وبال جاں
تہ خاک رات ہوا نہاں یہ خبر ہی تم نے سنا نہیں

ناصر اٹاوی

غزل

لبریز میں رکھتا ہوں خون دل مضطر سے
نسبت ہے یہ آنکھوں کو ساقی ترے ساغر سے

جب تم سے نہیں رکتا خود تیر نظر اپنا
بیکار شکایت ہے میرے دل مضطر سے

محدود نہیں تک ہے دنیائے وفا میری
جاؤں تو کہاں جاؤں بیدرد ترے در سے

اک قطرۂ خون دل تھا وہ بھی نہ رہا باقی
کیا بات بناؤں گا ظالم ترے نشتر سے

دل تو کسی بیکس کا ساقی نہیں بھر آیا
کیوں قطرے ٹپکتے ہیں پیہم ترے ساغر سے

ہر چاک گریباں کا اک محشر وحشت ہے
کس شان سے نکلا ہے دیوانہ ترا گھر سے

یوں گرم نگاہوں سے دیکھو نہ مجھے دیکھو
شعلے نہ بھڑک اُٹھیں سوز دل مضطر سے

ہم چاک گریباں کی وسعت کو بڑھا دینگے
اتنا کہ ملا دینگے خود دامن محشر سے

کب منزل مقصد کی صورت نظر آئے گی
واماندگیاں میری بیزار ہیں رہبر سے

پھر خون کے اشکوں نے دامن کی ہوس پائی
ہاں پھر دل محزوں کو تم چھیڑ دو نشتر سے

دل یعنی جو تھا پہلے خلوت کدۂ راحت
اٹھتا ہے دھواں ہادی کیوں آج اسی گھر سے

ہادی مچھلی شہری

غزل

نہ میں نالوں کا عادی ہوں نہ میں فریاد کا خوگر
کیا ہے ضبطِ غم نے لذتِ بیداد کا خوگر

بلا سے ہو جو ہے بے کیف سازِ نغمۂ ہستی
مرا ٹوٹا ہوا دل ہے کسی کی یاد کا خوگر

معاف اے دوست یہ سب تیری غفلت کا نتیجہ ہے
کہ اب فریاد سے معذور ہے فریاد کا خوگر

بھلا ہو ضبطِ غم کا اب نہیں تابِ تکلم بھی
کبھی میں بھی تھا بیدادِ ستم ایجاد کا خوگر

قفس کی زندگی اور وہ بھی اک مجبورِ بیکس کی
سراپا غم ہے اب بے مہریِ صیاد کا خوگر

فریبِ ہستیِ موہوم میں سرشار بھی آ کر
ہوا ہے رفتہ رفتہ رنجِ بے تعداد کا خوگر

سرشار کسمنڈوی

نوائے ہاتف

حسن نے دنیا کو بنایا ہے "طلسمِ اعجاز"
آج تک سر میں وہی گونج رہی ہے آواز

یاد ہے؟ میں ہوں وہی خلوتیِ راز و نیاز
پھر کہیں بھول نہ جانا، مجھے "وہ اے بندہ نواز"

دلِ برباد کو یہ عشق نے نعمت بخشی
بھر دیا ایک جہانِ اثر سوز و گداز

یہ تمنا ہے کہ، اب کوئی تمنا نہ رہے
سنوں، خاموشی کے لہجہ میں تمہاری آواز

آ بھی جا سامنے آنکھوں کے، یہ پردہ کیسا
مری راحت، مرے دلدار، مرے روح نواز

حسن سے عشق ہمیشہ یہ کہا کرتا ہے
اب بجز میرے نہیں کوئی بھی تیرا ہمراز

مبتلا میرے تصور میں ہیں وہ بھی ہاتف
یہ مرے عشقِ حقیقی نے دکھایا "اعجاز"

ہاتف